ماهنامه

آنکھ مچولی

دسمبر ۱۹۹۰ء

سال رواں کے اختتام پر آنکھ مچولی کے ساتھ ۱۹۹۱ء
کا خوبصورت پاکٹ کلینڈر بطور تحفہ قبول کیجیے

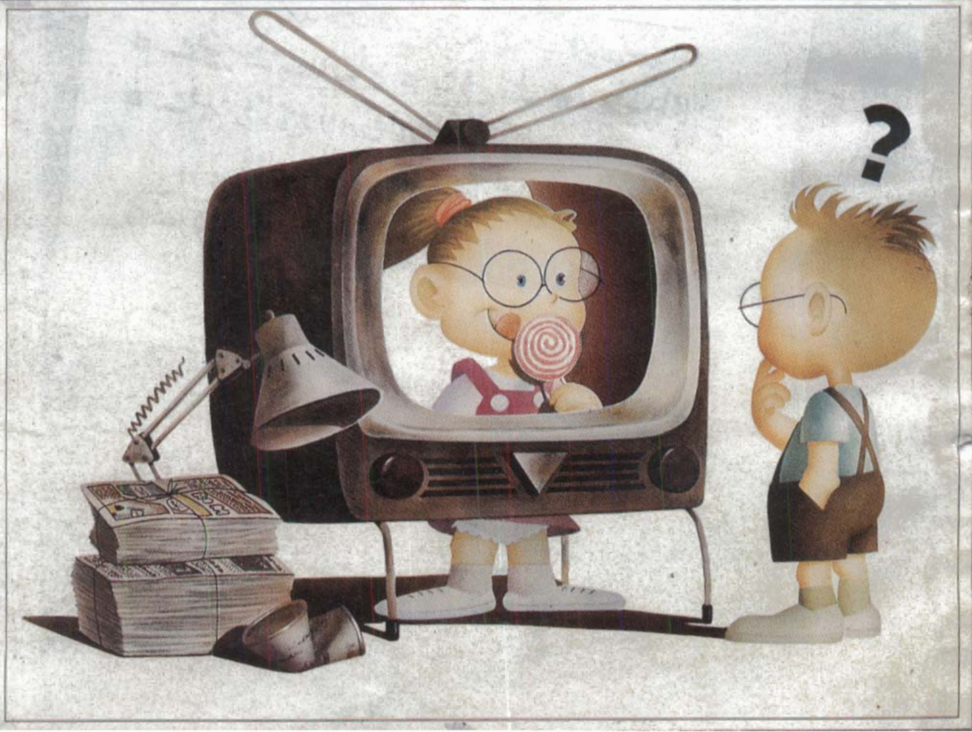

سب دوستوں کے لئے
ایک دوستانہ مشورہ

پیارے دوستو!

آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔
کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔

—— آپ سب دوستوں کے لئے، میرا دوستانہ مشورہ ——

ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

■ مے فیئر سوئٹیس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر مِلکا چیو
■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)

mayfair

اس سے پہلے کہ نزلہ زکام آپ کا گلا پکڑے...

... جوشینا لیجیے

نزلہ زکام عموماً گلے کی خراش سے شروع ہوتا ہے۔ توجہ نہ دی جائے تو پھر یہ گلے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے سینے پر حملہ آور ہوتا ہے اور کھانسی اور بخار کی نوبت آجاتی ہے۔ جوشینا ان تمام بیماریوں سے گلوخلاصی کا آسان نسخہ ہے۔

جوشینا، ہزار سال سے نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور بخار کے علاج کے لیے طبِ مشرق کے آزمودہ نسخے "جوشاندہ" کے نہایت مؤثر، کافی وشافی اجزا کا خلاصہ (ایکسٹریکٹ) ہے جو ہمدرد کے ماہرینِ فن نے آج کے مصروف انسان کے لیے تیار کیا ہے۔ اب آپ کو جوشاندہ ابالنے، چھاننے اور شکر ملانے کی ضرورت نہیں، ایک پیالی گرم پانی میں "جوشینا" حل کیجیے، جوشاندے کی ایک خوراک تیار ہے۔

جوشینا | جوشاندے کی مکمل توانائی

نزلہ، زکام، گلے کی خراش اور بخار کا مؤثر علاج

همدرد

جوشینا دو پیکنگوں میں دستیاب ہے
خوب صورت پلاسٹک مگ میں اور گتے کے کارٹن میں

آوازِ اخلاق
دیانت داری خود اعتمادی پیدا کرتی ہے

Adarts-JOS-2/89 R

دالبندین

ایک نئے رابطے کا آغاز

پی آئی اے ہفتے میں دو بار آپ کو
کراچی سے دالبندین براستہ تربت
لے جاتی ہے جہاں سے کوئٹہ کے لئے
فوری پرواز بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

جمعرات۔اتوار		دن		جمعرات۔اتوار
۱۲۵		پرواز نمبر پی کے		۱۲۶
ایف۔۲۷		طیارہ		ایف۔۲۷
اکانومی		درجہ		اکانومی
۰۷۴۵	روانگی	کراچی	آمد	۱۸۵۰
۰۹۳۵	آمد	تربت	روانگی	۱۷۱۵
۱۰۰۰	روانگی		آمد	۱۶۵۰
۱۱۲۵	آمد	دالبندین	روانگی	۱۵۲۵
۱۱۴۵	روانگی		آمد	۱۵۰۵
۱۳۰۵	آمد	کوئٹہ	روانگی	۱۳۴۵

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا قریبی پی آئی اے بکنگ آفس سے رابطہ قائم کیجئے۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD) IAL-PIA-32-90

نئی نسل کے اَدب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۵ شمارہ ۵ جمادی الاوّل ۱۴۱۱ دسمبر ۱۹۹۰ فون ۲۹۹۱۷۸

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شُدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیرِ اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت
۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

حسن ترتیب

۷	نعت	حافظ بشیر آزاد
۹	پہلی بات	اداریہ
۱۱	ڈیئر ایڈیٹر	ادارہ
۱۵	جب پہاڑ لرز اٹھے	عبیداللہ اظہر
۱۸	تین سو بچّوں کی دادی	سلمیٰ سلیم
۲۱	محمد علی جناح کا بچپن	طاہر مسعود
۲۸	چھکا صاحب	محمد پرویز آرائیں
۳۲	پیراشوٹ کی کہانی	شاہنواز فاروقی
۳۹	ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار	قدسیہ ممتاز
۴۱	ڈنڈا ڈولی	قارئین
۴۵	جھوٹ موٹ کا پاکستان	سلیم مغل
۴۸	کتّے بنے رہیے (نظم)	شاہنواز فاروقی
۴۹	لمبا ہاتھ	منیر احمد راشد
۵۷	بندر کینگرو	اخگر انوار
۶۱	فطرت کی دنیا	شین فاروقی
۶۵	جس نے اپنا کھیت نہ	رعنا اقبال
۶۹	زبان (نظم)	مولوی احمد علی
۷۱	جم ہینسن	آمنہ ابراہیم
۷۵	بلی، املی اور چغلی	محمد عمر احمد خان
۸۲	پاک دھرتی (نظم)	فضل ربی راہی
۸۳	جہانِ نو	محمد صالح ارشاد
۸۸	خدایا شکر ہے	صلاح الدین عباسی
۹۱	تلاش	محمد عارف انیس
۹۶	تعصّب	وقار عادل شیخ
۹۹	بی بطخ	عامر یونس
۱۰۴	ڈھال	لُبنیٰ اقبال
۱۰۷	غزل پزل	اُسامہ بن سلیم
۱۱۳	میری پہلی تحریر	قارئین
۱۱۹	چھوٹی دادی جان	صائمہ حنیف
۱۲۳	کم سن قلمکار	منتخب تحریریں
۱۳۳	روشن مثال (ذہین ساتھیوں کا تعارف)	
۱۳۸	امی ابو کا صفحہ	(انتخاب)

نعت رسول مقبول ﷺ

حافظ بشیر آزاد

رحمت کے خزانے بٹتے ہیں بخشش بھی عطا ہو جاتی ہے
دربارِ نبی ؐ میں لوگوں کی مقبول دعا ہو جاتی ہے

آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے سینے کے کنول کھل اٹھتے ہیں
جس کو بھی میسّر طیبہ کی پُر کیف فضا ہو جاتی ہے

بس عشقِ نبیؐ ہی مومن کا ہر عہد میں زندہ رہتا ہے
اور اس کے سوا اس دنیا کی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے

اعجاز نبوت کیا کہیئے ہونٹوں کی حلاوت کیا کہیئے
جو بات نکلتی ہے منہ سے قدرت کی رضا ہو جاتی ہے

طیبہ کی طرف جانے والو تعظیم کرو اس مرکز کی
برسوں کی قضا جس مرکز میں لمحوں میں ادا ہوجاتی ہے

سرکار ؐ میں در پر آیا ہوں اشکوں کے نگینے لایا ہوں
انسان ہوں اور نادانی میں انساں سے خطا ہو جاتی ہے

اے عشقِ نبی ؐ کے دیوانو دیدارِ نبی ؐ کی بات کرو
جس شے کی تمنا کی جائے اک روز عطا ہو جاتی ہے

دربارِ رسالت ؐ سے رکھّو اُمیّد کسی غم خواری کی
جب دستِ کرم اٹھ جاتا ہے ہر بات روا ہو جاتی ہے

آزاد نبی ؐ کی عظمت کا اقرار نہ کرنے والوں سے
راہیں بھی الگ ہو جاتی ہیں منزل بھی جدا ہو جاتی ہے

دلکشی، دلچسپیاں، باتیں حسیں
کیا ہے جو "اطفال نمبر" میں نہیں؟

بچّوں کے حوالے سے آنکھ مچولی کا خاص الخاص شمارہ "اطفال نمبر" یعنی بے شمار خوبصورتیوں کا سمندر آئندہ ماہ آپ کے دلوں میں ہلچل مچانے آرہا ہے۔

اس شمارے میں

- ○ ...... بچّوں کی ہو گئی ہے حکومت جہان پر
- ○ ...... تاریخ بنانے والے بچّے
- ○ ...... موجد بچّوں کے قصّے
- ○ ...... دیسی اور پردیسی بچّے
- ○ ...... بچّوں کی ادبیات سے بے مثل انتخاب
- ○ ...... بچّوں کی چند خواہشیں، بچّوں کے چند خواب
- ○ ...... ہنسانے اور رلانے والے قصّے
- ○ ...... وہ قصّے جن کے سب کردار بچّے

یعنی

جو سوچیں گے، وہ سب پائیں گے اس میں

آنکھ مچولی کا اطفال نمبر

لفظ لفظ بچّوں کی بات .... حرف حرف دلکش سوغات

پہلی بات

ایک عادت ہم لوگوں میں بہت بُری ہے............ اور وہ ہے دیواروں پر لکھنے کی عادت۔ آپ کسی بھی شہر یا دیہات میں چلے جائیں۔ دیواروں پر طرح طرح کے نعرے، دواؤں کے اشتہارات اور پوسٹر چپکے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ نعرے کون لوگ لکھتے ہیں؟ سیاسی جماعتوں کے کارکنان اور دوائیں بنانے اور بیچنے والے نیم حکیم اور وہ سارے لوگ جو قوم کی خدمت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان نعروں اور پوسٹروں میں ہوتا کیا ہے؟ دھمکیاں، مطالبات اور ایک دوسرے کی مذمّت۔ شاید ہی کبھی کوئی اچھی نصیحت آموز بات دیوار پر لکھی جاتی ہو۔ ظاہر ہے اچھی بات اچھے ہی لوگ لکھیں گے اور اچھے لوگ دیواروں پر لکھتے ہی کب ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی صاحب نے ہزاروں روپے خرچ کر کے اپنے مکان پر سفیدی کرائی اور راتوں رات کسی سیاسی جماعت نے یا کسی تجارتی کمپنی نے اسی پر اپنا نام یا نعرہ لکھ کر دیوار کا ستیاناس کر دیا۔ یہ کوئی اچھا رویہ نہیں۔ ذرا سوچئے اگر شہر کی دیواریں صاف ستھری ہوں، مکانات بے داغ اور چمکتے ہوئے ہوں تو خود آپ کو بھلا لگے گا۔ آپ کے شہر میں آنے والوں پر اچھا تاثر قائم ہوگا۔ ماحول کا صاف ستھرا ہونا بے حد ضروری ہے۔ نت نئے نعرے پڑھتے رہنے سے ذہن پراگندہ ہو جاتے ہیں............ یوں تو یہ کام بلدیاتی اداروں کے کرنے کا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بلدیاتی اواروں کا انتظام جن سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اِنہی کے کارکنان شہر کی دیواروں کو زیادہ گندہ کرتے ہیں۔ اور جب یہ سیاسی جماعتیں ہی اپنے شہر کو صاف ستھرا رکھنے میں دلچسپی نہیں لیتیں تو پھر تجارتی لوگوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ بھی اپنی مصنوعات کے اشتہارات سے دیواروں کو بھر دیتے ہیں۔ کچھ یہی حال اسکولوں اور کالجوں کا ہے جہاں لڑکے بالے اپنی پسند کی پارٹیوں اور سیاسی رہنماؤں کی تصویروں اور نعروں سے اپنے

اداروں کو بدنما بنا دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ سیاسی پارٹیاں اور سیاسی راہنما ملک و قوم کے بھلے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنا ہوتا ہے، مسائل پیدا کرنا نہیں۔ اس لئے ہم سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور اپنے ملک کے بچوں سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ سے کوئی بھی کہے .... لیکن دیواروں پر مت لکھئے .... اور کوئی لکھ رہا ہو تو اسے روکئے اسے سمجھائیے۔ اپنے محلے کے کونسلر سے رابطہ قائم کر کے دیواروں کو صاف ستھرا کرائیے۔ اور اگر دیواروں پر لکھنا بہت ضروری ہو تو آپ جس محلے یا علاقے میں رہتے ہیں وہاں کوئی نوٹس بورڈ رکھ دیجئے یا کوئی جگہ مخصوص کر دیجئے اور اعلان کرا دیجئے کہ جسے نعرے لکھنے ہوں وہ اس نوٹس بورڈ کو استعمال کر سکتا ہے .... یا اور کوئی طریقہ اختیار کیجئے تاکہ یہ بھانت بھانت کے نعرے شہر کی دیواروں کو خراب نہ کریں ....

یہ نہ بھولیئے کہ زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اب ہم غلام نہیں رہے آزاد ہو گئے ہیں .... اور آزاد قومیں مہذب طریقے سے زندگی گزارتی ہیں۔ ہمیں بھی اب مہذب ہو جانا چاہئے۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

ڈیئر ایڈیٹر

فاطمہ جعفری ناظم آباد، کراچی :۔ وہ دیکھیں میرا خط دیکھتے ہی آپ کی پیٹو ردّی کی ٹوکری کے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔ آپ کا اشارہ ملتے ہی میرا خط ڈکار لئے بغیر ہضم کر جائے گی۔ مجھے تو آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ آپ کا رسالہ اب پاکستان کا بہترین رسالہ بن چکا ہے اس لئے اب اس کے معیار کو برقرار رکھیئے گا۔

○ .... آپ کا خط جب ملا تو پیٹو ردّی کی ٹوکری اتنے خط ہضم کر چکی تھی کہ بھوک ختم ہو چکی تھی اس لئے جواب حاضر ہے "آنکھ مچولی" کو بہترین رسالے کا ایوارڈ ملا ہے اس پر ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں لیکن ابھی اسے جتنی ترقی کرنی ہے اور جتنا آگے بڑھنا ہے اس لحاظ سے ہم ابھی مطمئن نہیں ہیں اس کے معیار کو برقرار ہی نہیں رکھنا بلکہ بلند بھی کرنا ہے۔

صائمہ افضل ، سائرہ افضل ، ملتان :۔ آپ رسالے میں کوپن والے صفحے کو دانے دار چھاپا کریں تاکہ ہمیں پھاڑنے میں آسانی رہے اور اس صفحے کے دوسری طرف کوئی اشتہار دے دیا کریں تاکہ ہمارے امی ابو کا صفحہ بھی خراب نہ ہو۔

○ .... تجاویز اچھی ہیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عمران خان ، نارتھ ناظم آباد، کراچی :۔ مجھے نومبر کے شمارے میں جھیل معمے والا کھیل ملا وہ تو میں نے صحیح حل کر لیا ہے لیکن جب نام لکھنے کی باری آئی تو میری سٹی گم ہو گئی مگر پھر بھی کچھ غلطیاں ہو گئیں امید ہے معاف فرمائیں گے۔

○ .... میرے بھائی ایک آپ ہی نہیں اس معمے نے تو ہمیں بھی چکرا دیا تھا لیکن جو معمہ آدمی کو چکرا نہ سکے وہ معمہ تو نہیں کہلائے گا۔ کیا خیال ہے؟

اشعر زیدی ، نارتھ ناظم آباد ، کراچی :۔ میری تجویز یہ ہے کہ "ہوائیں کہ" کے سلسلے میں زیادہ مزاحیہ تحریریں شائع کی جائیں ، رسالے کی قیمت کم کریں ، نشان حیدر پانے والے جانبازوں کی سوانح عمری چھاپیں ، گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سے تازہ ترین معلومات پڑھنے والوں کو پہنچائیں ، رنگین صفحات میں اضافہ کریں..........

○ .... آپ نے تجویزیں تو نہیں دیں مطالبے ہی کئے ہیں اور وہ بھی ڈھیر سارے۔ اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ملک میں سارے مطالبے فوراً ہی پورے نہیں ہوتے۔

حارث وحید ، لاہور :۔ انکل :۔ آپ نے میرا خط نہ چھاپنے کی قسم کھائی ہوئی ہے اور اگر میرا خط چھپ بھی گیا تو مجھے معلوم ہے کہ آپ آگے سے اُلٹا جواب دیں گے۔

○ .... پیارے بھتیجے ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن اگر آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو پھر یوں کیوں نہیں کرتے سیدھا جواب لینے کے لئے اُلٹا سوال کریں۔

کاشف قدیر ، ڈیرہ اسماعیل خان :۔ انکل :۔ آپ کے رسالے میں میں نے کئی جگہ پر اللہ کی بجائے لفظ خدا لکھا پایا ہے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کہنا بہت بڑا گناہ ہے کیوں کہ لفظ خدا اللہ کے ننانوے مبارک ناموں میں شامل نہیں ہے اور نہ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

○ .... آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ لفظ خدا ننانوے اسمائے حسنیٰ میں شامل نہیں ہے لیکن یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے کہ لفظ خدا کے استعمال سے کوئی گناہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ کے لئے مختلف زبانوں میں مختلف لفظ ہیں اور مقصد سب کا اسی ہستی کی طرف اشارہ کرنا ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے ہاں یہ بات صحیح ہے کہ اللہ کا لفظ اگر ہم استعمال کریں تو یہ زیادہ بہتر بات ہے۔

راشد منظور ، شاہ فیصل کالونی ، کراچی

آپ کے رسالے میں بچوں کی پسند کا خیال نہیں رکھا جاتا کیونکہ اس میں جاسوسی یا ایڈونچر کہانیاں بہت کم بلکہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہیں مار دھاڑ تو بالکل بھی نہیں ہوتی کہ اس سے بچوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں میری تجویز یہ ہے کہ آپ ایک مضمون کراٹے کا فن سکھانے کے لئے ہر ماہ شائع کیا کیجئے۔

○ .... پیارے راشد! تمہیں آگے چل کر ایک ایسی زندگی گذارنی ہے جس میں نہ جاسوسی ہوگی نہ خواہ مخواہ کے ایڈونچر۔اس لئے ایسی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اپنے آپ کو غیر حقیقت پسند نہ بناؤ .... اور یہ تم کراٹے کیوں سیکھنا چاہتے ہو .... کسی سے ناراض ہو گیا؟

محمد ظفر اللہ ضیاء ، کمالیہ :۔ آنکھ مچولی کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے یہ جان کر ہمارا دل خوشی سے گارڈن گارڈن ہو گیا کہ جنوری کا شمارہ خاص نمبر ہوگا اور اس میں بچوں کے موضوع پر زیادہ سے زیادہ تحریریں شامل اشاعت ہوں گی مبارک .... مبارک .... مبارک۔

○ .... شکریہ .... شکریہ .... شکریہ .... خاص نمبر کے لئے کچھ آپ بھی تو لکھیئے۔

ذیشان بن نذیر ، فیصل آباد :۔ براہ کرم آنکھ مچولی کی لکھائی ذرا موٹی کریں کیوں کہ بزرگ لوگ جن کی نظریں کمزور ہوتی ہیں وہ یہ رسالہ نہیں پڑھ سکتے۔

○ .... پتہ نہیں آپ کی شکایت میں کوئی طنز تو نہیں ہے!!اس لئے کہ رسالہ تو ہم بچوں کے لئے چھاپتے ہیں ٹھیک ہے بزرگوں کے پڑھنے پر پابندی نہیں ہے لیکن ہمیں تو بچوں کی سہولت کو مدنظر رکھنا ہے لکھائی تو پہلے ہی اچھی خاصی موٹی ہوتی ہے۔

محمد سلیم جہانگیر، رحیم یار خان :۔ آپ جو خاص نمبر نکال رہے ہیں اس کا عنوان رکھیں "ننھے ہاتھ

بڑی تحریر۔"

○ .... عنوان اچھا ہے مگر لمبا ہے۔

سائرہ عباس ، ماڈل کالونی ، کراچی :۔ بچوں کے خصوصی شمارے کا عنوان "چلڈرن اسپیشل" رکھیں۔

○ .... عنوان انگریزی میں ہے اور ہم پہلے ہی انگریزی عنوانوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

حناخان ، گوجرانوالہ :۔ آنکھ مچولی کے رنگین صفحات کا معیار کافی خراب ہوگیا ہے اس سے پہلے تو اچھا بھلا تھا لیکن ان باتوں کے باوجود آنکھ مچولی میرا من پسند رسالہ ہے۔

○ .... بی بی ہم تو خوش ہو رہے تھے کہ رنگین صفحات کا معیار بڑھ گیا ہے آپ کی شکایت پڑھ کر ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ بے ہوش اس لئے نہ ہوسکے کہ رسالہ آپ کو پھر بھی پسند ہے۔

شاندانا ، پشاور :۔ ستمبر ۹۰ء کے شمارے میں کاشف عرفان کی نظم مسٹر عالمگیر چوری کی ہے آپ اسے فوراً بلیک باکس کیجئے۔

○ .... آپ کی ہدایت پر کاشف عرفان کو بلیک باکس کیا جارہا ہے یہ صاحب زادے اس سے زیادہ سزا کے مستحق ہیں کیوں کہ نظم ملنے پر ہم نے خط لکھ کر ان سے پوچھا تھا کہ یہ نظم آپ ہی کی ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ "بے شک کیونکہ میں چوری جیسی گھٹیا حرکت نہیں کرتا۔" کاش کاشف عرفان یہ گھٹیا حرکت نہ کرتے۔

فرحین ، ناظم آباد ، کراچی :۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ بچوں پر خاص نمبر شائع کر رہے ہیں مجھے بچوں سے بے حد پیار ہے میری آرزو ہے کہ دنیا کے سارے بچے خوش رہیں میں سوچتی ہوں کیا یتیم خانے یا اس طرح کے دیگر ادارے جہاں بچے اپنے چاہنے والوں کے بغیر رہتے ہیں ان تک آپ کا رسالہ پہنچتا ہے یا نہیں؟.......... اگر نہیں تو کیوں؟

○ .... ہمارے پاس جب ایسے اداروں کے خط آتے ہیں تو ہم انہیں چھان بین کے بعد اعزازی پرچے جاری کر دیتے ہیں تاہم کچھ فرض آپ لوگوں کا بھی ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔

عبیداللہ اظہر

جب پہاڑ لرز اٹھے

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: میں ایک اندھیری رات میں حضرت عمرؓ کے گھر کی طرف چلا۔ جب میں آدھے راستے پر پہنچا تو ایک اعرابی نے میرا دامن پکڑ کر کھینچا اور بولا "عباسؓ! میرے ساتھ آؤ۔" میں نے جو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو امیرالمومنین حضرت عمرؓ ہیں۔ وہ بھیس بدلے ہوئے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھا سلام کیا اور کہا "یاامیرالمومنین! کہاں کا قصد ہے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ "آج رات میں عرب قبیلوں کے حالات دیکھنا چاہتا ہوں اور جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہیں؟"

چنانچہ حضرت عمرؓ آگے آگے چلے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ آپؓ ایک ایک گھر اور ایک ایک خیمے کا چکر کاٹنے لگے۔ جب جائزہ تقریباً ختم ہو گیا تو ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اتنے میں ہم نے ایک خیمے میں ایک بوڑھی عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف کچھ بچے بیٹھے تھے۔ سامنے چولہے پر ایک ہانڈی چڑھی تھی اور وہ بوڑھی عورت بچوں سے کہہ رہی تھی بس ابھی کھانا پک جاتا ہے پھر کھانا۔ وہاں ہم کافی دیر تک کھڑے رہے۔ حضرت عمرؓ کبھی بوڑھی عورت کو دیکھتے کبھی بچوں کو۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا "یاامیرالمومنین! آپ یہاں کیوں رک گئے؟ اب تشریف لے چلیئے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا "خدا کی قسم، میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ہلوں گا، جب تک یہ بچے پیٹ

بھر کے کھانا نہیں کھالیں گے۔ "ہم ٹھہر گئے۔ بڑی دیر ہو گئی مگر کھانا تیار نہ ہوا اُدھر بچے زور زور سے رو رہے تھے۔ بڑھیا انہیں تسلیاں دیتی جارہی تھی۔ بس بیٹا، ذرا دیر اور صبر کر لو۔ ابھی کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا "آؤ اس بڑھیا کے پاس چلیں۔" یہ کہہ کر حضرت عمرؓ خیمے کے اندر چلے گئے میں بھی آپؓ کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بڑھیا کو سلام کیا۔ بڑھیا نے سلام کا جواب دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟" بڑھیا بولی "ہانڈی میں ہے کیا؟ چند کنکریاں ہیں کیا وہ کھلادوں"؟

حضرت عمرؓ آگے بڑھے انہوں نے ہانڈی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی ابل رہا ہے اور کنکریاں پک رہی ہیں۔ وہ بولے، "آخر اس کا کیا مطلب ہے؟" بڑھیا بولی، "کیا کروں، بچوں کو بہلا رہی ہو۔" حضرت عمرؓ نے دریافت کیا، "تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟" وہ بولی، "کیوں نہ ہو، نہ باپ نہ بھائی نہ شوہر اور نہ کوئی عزیز پھر مجھے کون پوچھے!"

حضرت عمرؓ بولے، "تم نے امیر المومنین عمر بن خطاب کو اپنے حالات کیوں نہ بتائے۔ وہ تمہارے لئے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیتے۔" یہ سن کر بڑھیا نے کہا، "خدا عمرؓ کو غارت کرے، خدا کی قسم اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے" یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کانپنے لگے۔ مگر بڑھیا سے بڑی نرمی سے کہا، "عمرؓ نے تم پر کیا ظلم کیا؟" بڑھیا بولی۔ "دائی (حاکم) کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے حال سے باخبر رہے۔ نہ جانے اور کون میری طرح تنگ دست، بچوں والا اور بے یار و مدد گار ہے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی خبر گیری کرے اور بیت المال سے ان کے لئے حسب ضرورت رقم مقرر کرے۔" اس پر حضرت عمرؓ بولے۔ اچھا میں ابھی آیا۔"

عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ باہر نکل آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا۔ اب رات کا آخری حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ہم چلے آرہے تھے اور راستے کے کتے ہم پر بھونکتے جارہے تھے۔ آخر کار ہم بیت المال تک پہنچ گئے۔ حضرت عمرؓ نے خود دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ بیت المال کے اندر پہنچ کر حضرت عمرؓ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پھر انہوں نے ایک بہت بڑی آٹے کی بوری اٹھالی اور مجھ سے کہا، عباسؓ! اسے میرے کندھے پر رکھ دیں۔" میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ پھر فرمایا، "تم یہ گھی کا برتن اور دوسرا کھانے پینے کا سامان اٹھالو۔" میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے دروازہ بند کیا اور ہم چل کھڑے ہوئے۔ آٹے کے ذرے حضرت عمرؓ کی داڑھی پر، آنکھوں پر اور پیشانی پر گرتے جارہے تھے مگر آپؓ برابر چلے جارہے تھے۔ فاصلہ کافی تھا لہٰذا آپ تھک گئے تھے۔ چنانچہ میں نے اس بوجھ کے اٹھانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے

ہوئے کہا، "یاامیرالمومنین! میرے ماں باپ آپ پر قربان لائیے میں اسے اٹھالے چلوں۔"

اس پر حضرت عمرؓ بولے، "خدا کی قسم، قیامت کے دن تم میرے جرم اور ظلم کا بوجھ نہیں اٹھا سکو گے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور خاص طور پر اس بڑھیا کا جو کنکریاں ابال کر اپنے بچوں کو بہلا رہی ہے۔ اللہ کے نزدیک کیا اس سے بڑا کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔ اے عباس! جلدی چلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ روتے روتے بچے ہلکان ہو جائیں۔" اب حضرت عمرؓ اور زیادہ تیز چلنے لگے۔ آپؓ تھک کر چور چور ہو چکے تھے کہ ہم بڑھیا کے خیمے تک پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے کندھے سے آٹے کی بوری اتار دی میں نے گھی کا برتن اور دوسرا سامان رکھ دیا۔

حضرت عمرؓ آگے بڑھے۔ ہانڈی کے اندر جو کچھ تھا اسے پھینک دیا اور ہانڈی کو دھو کر اس میں گھی ڈالا، پھر آٹا گوندھنے لگے۔ چولہے پر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ آگ بجھی جا رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بڑھیا سے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس لکڑیاں ہیں؟" "ہاں بیٹے ہیں۔ وہ رہیں۔" حضرت عمرؓ اٹھے اور لکڑیاں لے آئے، لیکن لکڑیاں گیلی تھیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ہانڈی چولہے پر رکھ کر منہ نیچا کیا اور پھونکنے لگے تاکہ لکڑیاں آگ پکڑلیں۔ خدا کی قسم، میں نے دیکھا کہ چولہے سے نکلتا ہوا دھواں حضرت عمرؓ کی داڑھی کے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ آخر کار بڑی دیر کے بعد آگ سلگ گئی۔ گھی پگھلنے لگا اور کڑکڑانے لگا۔ حضرت عمرؓ ایک لکڑی لے کر اسے دیگچی میں چلانے لگے۔

بچے برابر چیختے جا رہے تھے اور رو رہے تھے۔ آخر کار کھانا تیار ہو گیا اور بچوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر بعد بچے کھیلتے کھیلتے سو گئے۔ اب حضرت عمرؓ بڑھیا کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے، میں امیرالمومنین کا قرابت دار ہوں ان سے تمہارا حال بیان کروں گا۔ لہٰذا تم سویرے ان کے پاس پہنچ جانا، میں بھی وہاں ملوں گا۔ شاید خدا تمہارے لئے کوئی بہتری کی صورت پیدا کر دے۔" یہ کہہ کر حضرت عمرؓ وہاں سے روانہ ہو گئے، میں بھی ساتھ ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا، "اے عباسؓ! جب میں نے دیکھا کہ یہ بڑھیا کنکریاں ابال کر بچوں کو بہلا رہی ہے تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے پہاڑ لرز رہے ہوں اور میری پیٹھ پر گر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ میں اناج لایا اور ان کے لئے کھانا پکایا۔ پھر وہ بچے پیٹ بھر کر خوش کھیلتے کھیلتے سو گئے۔ اب میں محسوس کر رہا ہوں جیسے وہ پہاڑ میری پیٹھ سے اتر گئے ہیں۔

پھر ہم دونوں حضرت عمرؓ کے گھر پہنچے۔ میں نے بھی رات کا بقیہ حصہ وہیں گزارا۔ جب صبح ہوئی تو وہ بڑھیا آئی۔ حضرت عمر کو پہچان کر ڈر گئی۔ حضرت عمرؓ نے اسے تسلی دی اور بیت المال سے اس کا اور اس کے بچوں کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا، جو پابندی سے اسے ماہانہ ملنے لگا۔

پیار محبّت کی وادی
تین سو بچّوں کی دادی

سلمیٰ سلیم

دادیاں عام طور پر پیار محبت اور کہانیوں کے حوالے سے یاد رکھی جاتی ہیں۔ شہروں میں تو نہیں البتہ گاؤں دیہات میں دادیاں اب بھی انہی حوالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ تاہم دنیا میں ایک دادی ایسی بھی ہے جو پیار محبت کے علاوہ اپنے پوتوں، پوتیوں، پڑپوتوں، سکڑپوتوں، سکڑ سکڑ پوتوں کی غیر معمولی تعداد کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہو گئی ہے۔

اس دادی کا نام جینی مارشل ہے۔ اس خاتون کے پوتوں وغیرہ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ایک گاؤں آباد کر سکتی ہے۔ اس کے پوتوں اور پڑپوتوں وغیرہ کی تعداد ۳۴۱ ہے۔ جینی کی عمر اس وقت اکیانوے برس ہے۔

جینی کے اپنے بچوں کی تعداد ۱۷ ہے۔ جب کہ پوتوں کی تعداد ۷۷، پڑپوتوں کی تعداد ۱۹۹، سکڑپوتوں کی تعداد ۳۶ اور سکڑ سکڑ پوتوں کی تعداد ۳ ہے۔

جینی کہتی ہے۔ "میں بچوں کی کہانی کی اس بوڑھی کی طرح ہوں جو جوتے میں رہا کرتی تھی۔ میرے پوتوں وغیرہ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔"

جینی کے پوتوں کی عمر پانچ سے لے کر پچاس برس تک ہے۔ جب تک اس کے پوتوں وغیرہ کی تعداد بیس سے تیس کے درمیان تھی تو اسے ان کی سالگرہیں یاد رہتی تھیں مگر اب انہیں چند ہی کے جنم دن یاد رہتے ہیں۔

"جب کرسمس آتا ہے تو مجھے اپنے پوتوں کی جانب سے بہت سے کارڈ موصول ہوتے ہیں۔ تاہم میں نے برسوں پہلے ان کے لئے تحفے خریدنے چھوڑ دیئے تھے۔ کیونکہ ان سب کے لئے تحفے

خریدنے کی مجھے میں سکت نہیں۔ اب جب میرے پوتے وغیرہ مجھ سے ملنے آتے ہیں تو مجھے ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اور تم کس کے بچے ہو؟"

بہرحال جینی کی سالگرہ کے موقع پر اس کے تمام پوتے، پڑپوتے وغیرہ اس کے دس ایکڑ کے فارم پر جمع ہوتے ہیں۔ جینی کے برعکس اس کی ایک بیٹی کو اس کے تمام پوتوں وغیرہ کے نام یاد ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنی دادی سے ملنے آتے ہیں تو اس کی بیٹی اس کے کان میں بتا دیتی ہے کہ یہ کون ہے؟ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ایک بار جینی کا ایک سکڑ پوتا آیا اور اپنی دادی کی گود میں بیٹھ کر بڑے پیار سے بولا "I Love You Granny" جینی کے بقول "یہ فقرہ سنتے ہی میری آنکھ میں آنسو آگئے اور میں نے چاہا کہ میں بھی اس کے لئے یہی فقرہ دہراؤں لیکن اس سے قبل اس کی شناخت ضروری تھی۔ اس کے لئے میں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بیٹی نے بتایا کہ یہ روبن ہے۔ چنانچہ تب میں نے کہا۔ روبن میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں۔"

اکیانوے برس کی عمر میں بھی جینی تمام دن اپنے فارم پر سبزیوں کی کیاریوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اسے اپنے پوتوں پڑپوتوں وغیرہ سے بڑی محبت ہے۔ جینی انہیں اپنی خوشی اور اچھی صحت کا باعث قرار دیتی ہے۔ اور خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین دادی تصور کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے اس خیال میں رتی برابر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا! کیوں جناب؟

محمد علی جناح کا بچپن

طاہر مسعود

کھارادر کراچی کے گنجان اور نہایت بارونق علاقوں میں سے ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل ایسا نہیں تھا تب یہاں تھوڑے سے گھر آباد تھے اور سمندر کا نمکین پانی اس کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں آتا رہتا تھا اسی لئے علاقے کا نام کھارادر پڑا۔ یہ اس وقت بھی شہر کا کاروباری مرکز تھا اور یہاں کے گھروں میں گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے ہوئے تاجر لوگ رہتے تھے۔ اسی علاقے میں نیو نہم روڈ کے کنارے ایک عمارت تھی جس کی پہلی منزل پر دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جس کا رخ مغرب کی سمت تھا۔ سمندر کی تیز اور پُرشور ہوائیں کھڑکیوں اور دروازوں سے گزرتی رہتی تھیں۔ یہاں کاٹھیاواڑ کی شاہی ریاست گونڈل کے ایک دیہات سے آیا ہوا کنبہ رہتا تھا۔ یہ تجارت پیشہ گھرانہ تھا جناح پونجا اپنی بیوی میٹھی بائی کے ہمراہ کراچی تجارت ہی کی غرض سے آئے تھے۔ شروع میں نوجوان جناح پونجا کو کاروبار میں دشواری اٹھانی پڑی لیکن پھر ان کی قسمت چمک اٹھی اور ایک برطانوی فرم گراہمز اینڈ کمپنی کے تعاون سے ان کا کاروبار تیزی سے ترقی کرنے لگا۔

جن دنوں نوجوان جناح کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا انہی دنوں وہ اور ان کی بیوی میٹھی بائی ایک گہری الجھن میں گرفتار تھے اور اس الجھن کا سبب ان کا لڑکا محمد علی تھا جو ابھی صرف چھ سال کا تھا دبلا پتلا، کمزور سا اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے پتلے اور سر طویل اور لمبوترا سا تھا جب وہ پیدا ہوا تھا تب بھی ایسا ہی تھا ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ظاہری کمزوری کے سوا بچے میں کوئی اور نقص نہیں ہے۔ یہ سن کر والدین مطمئن ہوگئے تھے مگر ماں نے اپنے بچے میں ایک عجیب سی نشانی تلاش کرلی تھی محمد علی کی انگلیوں پر ایک گول چکر دار نشان تھا............ ماں کہتی تھی کہ یہ پدم کا نشان ہے اور میرا بیٹا ضرور ایک دن راجہ بنے گا مگر اس نشانی کے سوا بچے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے ماں کی رائے درست معلوم ہوتی ہو۔

والدین کی الجھن یہ تھی کہ محمد علی کو لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اسکول چونکہ گھر سے دور تھا۔ اس لئے والد نے گجراتی پڑھانے کے لئے ایک ٹیوٹر رکھ دیا تھا جو روزانہ آکر پڑھنے کے لئے سبق دیتا تھا لیکن ننھے محمد علی کا دل پڑھائی میں کب لگتا تھا ٹیوٹر کے جاتے ہی اسے آزادی کا احساس ہوتا اور وہ بھاگتا ہوا باہر نکل جاتا اور پڑوسی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مشغول ہو جاتا۔ محمد علی کو مختلف کھیلوں میں مہارت حاصل تھی۔ بچے ہر کھیل کے لئے پہلے اسی کی طرف دیکھتے گویا انہوں نے خاموشی سے محمد علی کو اپنا لیڈر مان لیا تھا خود محمد علی کو بھی احساس تھا کہ وہ کھیل کے میدان میں دوسروں سے بہت بہتر ہے۔

محمد علی کی عمر نو سال ہوئی تو اسے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا گیا اب محمد علی کے پاس کھیلنے کے لئے بہت کم وقت رہ گیا تھا امتحانات کے نتائج آئے تو والدین کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ لڑکوں نے محمد علی کو پیچھے چھوڑ دیا تھا باپ تو اس لئے مایوس تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح محمد علی میٹرک پاس کرلے تاکہ ان کے کاروبار میں شریک ہوسکے لیکن ماں کی مایوسی تو بہت گہری تھی اس کی آنکھوں کے سامنے تو بیٹے کی انگلیوں پر پدم کا نشان گھومتا رہتا تھا اور جس کا اظہار وہ اکثر سب کے سامنے کرتی رہتی تھی "میرا محمد علی بہت بڑا آدمی بنے گا۔" وہ سنجیدگی سے کہتی۔

لیکن محمد علی............ وہ تو تعلیم میں سنجیدہ ہی نہیں تھا ماں کو اپنے خواب ٹوٹ کر بکھرتے محسوس ہو رہے تھے امتحان کا نتیجہ خود محمد علی کے لئے بھی نہایت توہین آمیز تھا یہ ٹھیک ہے کہ اسے پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے اپنی عزت کا شدید احساس تھا امتحان میں پیچھے رہ جانے کا محمد علی پر الٹا اثر ہوا۔ اب وہ اسکول اور کتابوں سے جی چرانے لگا۔

تب ایک دن، ماں نے کہا "محمد علی! میرے بیٹے! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا بات ہے امی۔" محمد علی نے پوچھا۔

"محمد علی! میں چاہتی ہوں کہ تم ایک دن بہت بڑے آدمی بنو لیکن اس کے لئے تمہیں نہایت محنت کرنی پڑے گی .... تمہیں تعلیم میں سنجیدہ ہونا پڑے گا اس کے بغیر تم زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

محمد علی نے ماں کی بات سن لی .... لیکن اس کی سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ جب تعلیم میں اسے کوئی دلچسپی ہی محسوس نہیں ہوتی تھی تو وہ اس میدان میں کیسے قدم بڑھا سکتا تھا۔

محمد علی کے والد جواب تک صبر اور نرمی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے تھے آخر کار ایک دن بول پڑے۔

"محمد علی .... میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اپنی کتابوں پر توجہ نہیں دیتے۔"

"ابا جان" ننھے محمد علی نے کہا "مجھے اسکول جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ابا جان .... میں آپ کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر کاروبار سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ابھی تم اس کے لئے بہت چھوٹے ہو محمد علی۔" والد نے کہا۔

"میں آپ کے دفتر میں بیٹھ کر اسکول سے زیادہ بہتر کام کروں گا۔" محمد علی نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن محمد علی .... میرے دفتر کا ڈسپلین بہت سخت ہے تمہیں میرے ساتھ صبح آٹھ بجے دفتر جانا پڑے گا دوپہر کے کھانے کے لئے ہم دو بجے سے چار بجے تک گھر واپس آئیں گے اور ایک بار پھر ہمیں چار سے نو بجے رات تک دفتر میں رہنا ہوگا۔" والد نے بتایا ان کا خیال تھا کہ محمد علی اتنی محنت کے خیال سے گھبرا اٹھے گا لیکن محمد علی نے یہ کہہ کر انہیں حیران کر دیا۔

"میں ایسا ہی کروں گا ابا جان۔"

"مگر تمہیں کھیلنے کے لئے بالکل وقت نہیں ملے گا۔" والد نے خبردار کیا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔"

شاید بات کچھ ایسی تھی کہ محمد علی کو کھیل چھوڑنا گوارہ تھا لیکن اس اسکول جانا پسند نہ تھا جہاں بے عزتی ہوئی تھی جہاں امتحان میں لڑکوں نے اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

اب محمد علی نے اپنے والد کے ہمراہ دفتر جانا شروع کر دیا تھا لیکن وہاں محمد علی کی دلچسپی کا کوئی کام نہ تھا بڑے کام کرنے کی محمد علی میں صلاحیت نہیں تھی اور چھوٹے موٹے کام کرنا پسند نہ تھا دفتر کا ماحول اداس اور بیزار کر دینے والا تھا دفتر میں رکھے رجسٹروں اور کھاتوں کو دیکھ دیکھ کر محمد علی کو وحشت ہوتی تھی اور

کیوں نہ ہوتی اسے نہ لکھنا پڑھنا آتا تھا اور نہ حساب کتاب کرنا۔
آخر وہ اپنے دلچسپ کھیلوں کی دنیا سے کٹ کر یہ کن جھمیلوں میں آپھنسا تھا چنانچہ ابھی دو مہینے ہی گذرے تھے کہ محمد علی نے اپنے والد سے کہا۔
"ابا جان مجھے دفتر میں کام کرنا پسند نہیں ہے۔"
"پھر تم کیا کرو گے محمد علی۔"
"میں واپس اسکول جانا چاہتا ہوں۔"
محمد علی کی زبان سے یہ الفاظ سن کے والد کو بہت خوشی ہوئی............ لیکن انہوں نے مناسب سمجھا کہ بیٹے کو زندگی کا ایک اہم اصول بتلا دیا جائے۔
"دیکھو بیٹا" انہوں نے کہا "زندگی کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں۔"
"ابا جان .... وہ کون کون سے ہیں؟"
"ایک یہ کہ آپ اپنے بزرگوں کی عقل اور تجربے پر بھروسہ کریں ان کی نصیحت کو قبول کریں اور ان کے مشورے کے عین مطابق عمل کریں۔"
"اور دوسرا راستہ کون سا ہے ابا جان؟" محمد علی نے جلدی سے پوچھا جیسے پہلا راستہ اس کے من کو نہ بھایا ہو۔
"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اپنے راستے پر چلیں غلطیاں کر کے ان سے سبق سیکھیں اور زندگی کی شدید اور تکلیف دہ ٹھوکروں اور مشکلات سے زندگی کو سیکھیں اور سمجھیں۔"
محمد علی نے چپ چاپ یہ بات سنی۔ یہ دوسرا راستہ ہی ٹھیک تھا آدمی کو اپنے پیروں پر ہی چلنا چاہئے دوسروں کے کندھوں کا سہارا لے کر چلنا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔
محمد علی واپس اسکول آئے تو اب وہ کسی قدر بدل چکے تھے ان کا وقت پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا تھا ان کے ہم جماعت لڑکے آگے نکل چکے تھے اب وہ راتوں کو دیر تک پڑھتے، محنت سے اپنا سبق یاد کرتے والد ان کی پڑھائی سے خوش تھے لیکن ایک دن جب انہوں نے محمد علی کے استاد سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا تو یہ سن کر انہیں دھچکا لگا کہ محمد علی حساب میں بہت کمزور ہے۔
"اس لڑکے سے توقعات وابستہ کرنا بے سود ہے۔" والد نے سوچا جو لڑکا حساب میں کمزور ہو وہ مستقبل میں کاروبار کیسے کر سکتا ہے دوسرے لفظوں میں ان کے بعد ان کے تجارتی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی کا مستقبل تاریک تھا۔ والد کو محمد علی کی طرف سے شدید مایوسی تھی لیکن والدہ کا محمد علی کی روشن تقدیر پر اعتماد ابھی تک برقرار تھا۔

قائداعظم ایک بچّی سے بات کرتے ہوئے۔

قائداعظم کے عہدِ جوانی کی ایک یادگار تصویر۔

"تم دیکھنا تو سہی"۔ وہ اپنے شوہر سے کہتیں "میرا محمد علی بہت اچھے کام کرے گا اور بہت سے لوگ اس سے حسد کرنے لگیں گے"

والد کا اعتبار اب اس قسم کی باتوں پر سے ختم ہو گیا تھا انہوں نے اسی میں بہتری سمجھی کہ محمد علی کو اس ماحول سے نکالا جائے جہاں گولیاں، لٹو، گلی ڈنڈا اور کرکٹ نے اس کی تعلیم سے دلچسپی ختم کر کے رکھ دی تھی اب کے محمد علی کا داخلہ گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ایک اسکول میں ہوا اسکول کا نام تھا سندھ مدرستہ الاسلام۔ محمد علی کی عمر دس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک وہ چوتھی جماعت میں تھے اسکول تبدیل ہو جانے کے بعد بھی ان کا رجحان کھیل کی طرف سے نہیں ہٹا۔

انہی دنوں بمبئی سے محمد علی کی پھوپھی مان بائی آئی ہوئی تھیں انہوں نے تجویز پیش کی کہ تعلیم سے بیزار بھتیجے کو ان کے ساتھ بمبئی روانہ کر دیا جائے ممکن ہے ماحول بالکل ہی تبدیل ہو جانے کا کوئی خوشگوار اثر ہو اور یوں محمد علی کو بمبئی بھیج دیا گیا۔ بمبئی کے انجمن الاسلام میں محمد علی نے تعلیم میں دلچسپی دکھائی اور آخر کار گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کر لی۔ اس طرح انہیں انگریزی کی پہلی جماعت میں داخلہ لینے کی اجازت مل گئی۔

لیکن محمد علی کی والدہ کا کراچی میں بُرا حال تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ

تھیں انہیں وہ دن خوب یاد تھا جب ننھے محمد علی کی رسم عقیقہ کے لئے حسن پیر کی درگاہ تک جانے کے لےء وہ ایک نازک سی کشتی میں سوار تھیں۔ محمد علی ان کی گود میں سویا ہوا تھا اور کشتی کھلے سمندر میں طوفان میں گھر گئی تھی تب ان کا دل اپنے محمد علی کی حفاظت کے لئے کس بُری طرح سے دھڑکا تھا اور انہوں نے کیا کیا منتیں نہ مانی تھیں خدا خدا کر کے طوفان ٹل گیا تھا محمد علی جب تک بمبئی میں رہے ماں انہی یادوں میں کھوئی رہی آخر کار بیٹا اپنی تعلیم مکمل کئے بغیر کراچی .... ماں کے پاس لوٹ آیا۔

محمد علی کا داخلہ ایک بار پھر سندھ مدرسہ میں کرایا گیا۔

لیکن اب محمد علی کو کتابوں سے زیادہ گھڑ سواری میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ دن تو وہ اسکول میں گزارتے اور شام کو اپنے دوست قاسم کے ساتھ دور تک گھڑ سواری کیا کرتے تھے محمد علی کو گھوڑوں سے بہت پیار تھا کیونکہ گھوڑے تن کر کھڑے ہوتے تھے ان میں چستی اور پھرتی ہوتی تھی وہ کمزور بزدل اور ڈرے ہوئے نظر نہیں آتے تھے وہ باوقار اور خوبصورت تھے وہ جب گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ لگاتے تھے تو انہیں بہت مزہ آتا تھا ہوا کی چادر کو چیرتے ہوئے وہ آگے اور آگے ہی بڑھتے جاتے تھے لیکن ان کی تعلیم .... وہ تو ابھی تک پیچھے ہی رہی جاتی تھی اور اس عرصہ میں وہ اپنی مرضی سے مزید دوبار اسکول بدل چکے تھے ان کی عمر پندرہ برس ہوچکی تھی اور تعلیم پرائمری سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

"آخر میرا بیٹا کیا بنے لگا؟" والد کے سامنے یہی ایک سوال تھا انہوں نے اپنے دوست اور گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر سے اس مسئلے کا ذکر کیا انگریز دوست نے پیش کش کی کہ وہ محمد علی کو لندن میں اپنی فرم کے صدر دفتر میں تین سال کے لئے بھجوا سکتا ہے جہاں محمد علی کو کاروباری نظم و نسق چلانے کی عمدہ تربیت دی جائے گی اس تربیت کے بعد محمد علی اپنے والد کے کاروبار کو سنبھال سکے گا۔

والد تو تیار ہوگئے لیکن مسئلہ والدہ کا تھا جو محمد علی کو خود سے جدا کرنے کے لئے تیار نہ تھیں انہیں سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ محمد علی لندن جا کر کسی میم سے بیاہ رچالے گا اور اس طرح ان کے سارے ارمان خاک میں مل جائیں گے۔ والدہ نے بڑی مشکل سے اس شرط پر لندن جانے کی اجازت دی کہ پہلے محمد علی کی شادی کر دی جائے۔ جھٹ پٹ محمد علی کا رشتہ طے پایا اور ایمی بائی سے شادی انجام پاگئی۔

محمد علی کی لندن روانگی کا وقت قریب آگیا والدہ کے لئے تین سال تک کی جدائی کا تصور ناقابل برداشت تھا۔

"میرے بیٹے!" انہوں نے محمد علی سے کہا "میں تم سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی مگر مجھے یقین ہے کہ انگلینڈ جا کر تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے یہ میری زندگی کا خواب ہے۔" بیٹے نے سر جھکا کے یہ بات سنی، ماں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"محمد علی تم ایک طویل سفر پر جا رہے ہو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں انگلینڈ سے واپس آتا دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہوں گی۔" اس کے بعد وہ رونے لگیں محمد علی نے والدہ کو گلے لگایا۔

"محمد علی خدا تمہاری حفاظت کرے گا .... وہ میری خواہش کو ضرور پورا کرے گا۔ تم بڑے آدمی بنو گے اور مجھے تم پر فخر ہو گا۔"

والدہ نے محمد علی کو الوداع کہتے ہوئے دعائیں دیں۔

.... ○○ ....

لندن پہنچ کر محمد علی نے اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب اور بالکل نامانوس ماحول میں پایا وہاں وہ کسی کو نہیں جانتے تھے۔ اوپر سے لندن کی سخت سردی اور دھند نے انہیں پریشان کر دیا تھا کچھ دنوں انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور پھر ایک اخبار کا اشتہار دیکھ کر ایک گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے مقیم ہو گئے وہ صبح سویرے اٹھ کر ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے۔ اخبار میں برطانوی سیاستدانوں کے بیانات اور پارلیمنٹ میں ہونے والی بحثیں وہ شوق سے پڑھتے تھے جس کے بعد وہ گراہم اینڈ کمپنی کے دفتر میں تربیت حاصل کرنے چلے جاتے تھے لیکن وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ کاروباری تربیت حاصل کر کے وہ صرف پیسہ کمانے والی مشین بن جائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روپیہ پیسہ کی بڑی اہمیت ہے لیکن خدا نے انہیں صرف اسی لئے تو پیدا نہیں کیا۔ یہیں سے محمد علی کی شخصیت بدلنی شروع ہوئی وہ خول ٹوٹنے لگا جس کے اندر وہ اب تک بند تھے انہیں اسکول کی کتابوں میں اب تک دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اب ان کے اندر پڑھنے کی ایک پیاس پیدا ہو گئی تھی انہوں نے برطانوی سیاستدانوں، برطانیہ کی تاریخ اور ان کی عوامی زندگی کے بارے میں مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی انہی موضوعات پر بحث و مباحثہ بھی کرنے لگے بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ انہیں گراہمز اینڈ کمپنی میں کام کرنے کے بجائے کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لے کر بیرسٹر بننا چاہیئے۔

محمد علی نے ابتدائی امتحانات پاس کرنے کے بعد بار ایٹ لاء کرنے کے لئے لنکزان میں داخلہ لے لیا لنکزان میں داخلہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ محمد علی نے اس کے دروازے پر دنیا کے بڑے بڑے قانون سازوں میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسم مبارک بھی لکھا ہوا دیکھا تھا۔ ابھی ان کی تعلیم مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ والد نے انہیں خط لکھا کہ وہ تعلیم میں تین سال ضائع کرنے کے بجائے گھر لوٹ آئیں .... محمد علی نے والد سے درخواست کی کہ انہیں تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دی جائے .... اور یہ کہ انہیں پیسے نہ بھجوائے جائیں کیونکہ وہ اپنے اخراجات کا بندوبست خود کر لیں گے یہ کیسی عجیب بات تھی کہ پہلے والد کو محمد علی سے تعلیم میں دلچسپی نہ لینے کی شکایت تھی اور اب محمد علی والد سے

التجا کر رہے تھے کہ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔

لندن میں دوران تعلیم محمد علی کو دو سانحے برداشت کرنے پڑے ان کی بیوی ایمی بائی کا انتقال ہوگیا............ اس سے بڑا سانحہ والدہ کی رحلت تھی محمد علی پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے وہ ماں چل بسی تھی جو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی جنہوں نے محمد علی کے ایک بڑا آدمی بننے کی پیش گوئی کی تھی اور جب بیٹا اس راستے پر چل پڑا تھا تو ماں دنیا میں نہیں رہی تھی۔

لندن میں محمد علی نے تعلیم میں گہری دلچسپی لی انہوں نے کسی تفریحی مشغلے اور دوسری دلچسپیوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا وہ پارلیمینٹ کے اجلاسوں کو دیکھنے کے لئے بھی جاتے تھے اور گیلری سے سیاستدانوں کی تقریریں سنتے تھے۔ اور یوں ان کی سیاسی تربیت ہونے لگی لیکن اس وقت تو خود محمد علی جناح کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مستقبل میں ایک عظیم لیڈر اور ایک مملکت کے بانی ہوں گے اور دنیا انہیں قائداعظم کے نام سے پکارے گی۔

محمد علی جناح کے بچپن کے حالات پر جب نگاہ کی جاتی ہے تو ابتدا میں ان کی تعلیم سے دلچسپی نہ لینے کا ایک ہی سبب سمجھ میں آتا ہے کہ قدرت نے انہیں ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا تھا۔ کسے خبر کہ اگر محمد علی اسکول کے زمانے میں ایک اچھے طالب علم ہوتے تو میٹرک پاس کرتے ہی والد انہیں کاروبار میں شریک کر لیتے اور یوں انہیں برطانیہ جاکر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا اور آج ہمارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا۔

(اس مضمون کی تیاری میں ان کتابوں سے مدد لی گئی۔)

۱۔ میرا بھائی .... فاطمہ جناح

۲۔ محمد علی جناح .... ہیکٹر بولائتھو

۳۔ قائداعظم میری نظر میں .... مرتب:۔ زکریا ساجد

چھکّا صاحب

محمد پرویز آرائیں

ہمارے قصبے میں کیا خود ہمارے محلے میں ایک ماہر کرکٹر رہتے ہیں جنہیں نہیں معلوم کس قسم کی گستاخی کے تحت محلے کے لڑکوں نے چھکّا صاحب کہنا شروع کر دیا تھا اور پھر ان کا یہ لقب اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے مقابلے میں ان کا اصلی نام اس طرح گم ہو کر رہ گیا جیسے کسی عظیم الشان چھکّے کے بعد گیند۔

چھکّا صاحب کو کرکٹ کے متعلق اس قدر معلومات تھیں اور وہ اس کی ہر پھانس کا ایسا بانس اور ہر رائی کا ایسا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیتے کہ بہت سے سننے والوں کو یہی شبہ ہونے لگتا کہ شاید یہ کھیل انہوں ہی نے ایجاد کیا تھا۔ کرکٹ کے بڑے سے بڑے کھلاڑی اور کپتان پر اعتراض کر بیٹھنا اور اسے اناڑی ثابت کر دینا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے۔ نقو، بدھو، خیرو کا تو ذکر ہی کیا بڑی سے بڑی شہرت والے کھلاڑیوں کی کمزوریاں اور دُکھتی رگیں ان کے حافظے میں ایسی محفوظ تھیں جیسے کسی تھانے میں بدمعاشوں کی ہسٹری شیٹ۔ اور پھر ہر قابل ذکر کھلاڑی کی اصلاح اور تربیت کے ایسے کامیاب اور مستند نسخے بتاتے کہ اگر وہ خود انہیں سن پائے تو یقیناً کرکٹ سے توبہ کر کے میدان سے نکل بھاگے۔

بدقسمتی سے اگر کبھی چھکّا صاحب کے ساتھ ریڈیو سے کسی میچ کی کمنٹری سننے کا اتفاق ہوجاتا تو کرکٹ کی باریکیوں کے ندی اور نالے کیا دریا اور سمندر بہہ نکلتے۔ وہ ایک ایک گیند پر اس قابلیت سے بے ساختہ تبصرہ کرتے جاتے کہ دونوں ٹیموں کے ہر کھلاڑی پر بے اختیار غصہ آنے لگتا کہ اس کو کھیل ویل تو آتا نہیں مفت میں بے وقوف بنا کر وقت خراب کر رہا ہے۔ بڑی خود اعتمادی سے فرماتے۔ اس موقع پر اس بولر کو نہیں اس بولر کو باؤلنگ کرنی چاہئے تھی۔ کھلاڑی کو یہ گیند ایسے کھیلنا چاہئے تھی...... ہائے ہائے اسکوئر لیگ کی کیسی باؤنڈری کھودی...... سلپ خالی پڑی تھی۔ گیند کو بس ذرا سا اشارہ کر دیتا تو کم سے کم دو رنز تو کہیں نہیں گئے تھے...... فیلڈنگ کی ترتیب بالکل ہی بے تکی ہے...... فلاں جگہ فلاں کھلاڑی کو ضرور موجود رہنا چاہئے تھا۔ ...... فلاں بولر کپتان کا رشتہ دار معلوم ہوتا ہے اسی نامعقول سے بار بار گیند کروائی جارہی ہے۔ اور پھر جب وہی نامعقول بولر کوئی وکٹ لے لیتا تو غصے کا دھارا بیٹسمین کی طرف مڑ جاتا...... اس کم بخت کو کرکٹ کے بجائے گلی ڈنڈا کھیلنا چاہئے۔ مفت میں ناک کٹوا رہا ہے باپ دادا کی وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر عام تبصروں اور تنقیدوں کی تو کوئی حد اور انتہا ہی نہیں تھی۔ فلاں کھلاڑی بڑا بیٹسمین بن کے آیا ہے لیکن گگلی سے اس کی نانی مرتی ہے۔ فلاں بولر گیند کیا پھینکتا ہے پھاوڑہ چلاتا ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ عیب ہے اور فلاں کھلاڑی میں وہ نقص۔ ان کے ساتھ سننے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کرکٹ میچ کی کمنٹری نہیں بلکہ کھیلنے والوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سن رہے ہیں اور اگر چھکّا صاحب کا بس چلتا تو وہ ان کھلاڑیوں کو کرکٹ کھیلنے کی اجازت دینے کے بجائے منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر شہر بدر کئے بغیر دم نہ لیتے۔ اور اگر شامت اعمال سے چھکّا صاحب کے ساتھ کوئی میچ دیکھنے کا اتفاق ہوجاتا تو بس قیامت ہی آجاتی۔ ان کی کڑی اور بال کی کھال اتارنے والی نکتہ چینی سے کھلاڑی تو کھلاڑی امپائر اور سلیکشن کمیٹی کے ممبران کو کالے پانی بھیج دینے کو جی چاہنے لگتا۔ کرکٹ کے کھیل سے طبیعت ایسی بدمزہ ہوجاتی کہ عہد کر لیتے کہ اب کافی عرصہ تک یہ منحوس کھیل نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ سننے کے روادار ہوں گے اور خود چھکّا صاحب کو دیکھ کر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوجاتی جیسے کوئی انتہائی دہشت ناک خواب دیکھ رہے ہوں۔

اکثر جب چھکّا صاحب کی باتوں پر سننے والوں کی طبیعت زیادہ جل جاتی تو کوئی نہ کوئی عاقبت نااندیش پوچھ ہی بیٹھتا کہ حضرت خود آپ نے کرکٹ کے یہ سب گُر کہاں اور کب سیکھے؟ اور اس دل پسند بولنگ پر چھکّا صاحب خوش ہو کر فوراً بے تحاشا چوکے پر چوکا اور چھکے پر چھکا سر کرنے لگتے۔ اجی میں اپنے مڈل سکول میں کپتان تھا اور جب میں ہائی سکول میں تھا تو میں نے سکول کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تابڑ توڑ دو سنچریاں بنائی تھیں اور جب کالج میں تھا تو میں نے صرف الٹے ہاتھ سے نو کیچ لئے تھے اور جب میں یونیورسٹی میں تھا تو ایک

مرتبہ پہلی اننگز میں میں نے دو سو گیارہ رن ناٹ آوٹ اور دوسری اننگز میں ایک اوور میں پانچ وکٹ لئے تھے اور ایک ٹورنامنٹ میں...... وغیرہ وغیرہ اور چھکا صاحب کی کامیابیوں کا یہ سلسلہ اس قدر طویل اور صبر آزما ہو جاتا کہ ان کا ہر مخاطب یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ اگر دنیا کی تمام ٹیمیں بیک وقت چھکا صاحب سے زور آزمائی کی جرأت کریں اور وہ ان کے مقابلے میں صرف تن تنہا چلے جائیں تب بھی میدان یقیناً ان ہی کے ہاتھ رہے گا۔ اور غالباً اسی وجہ سے وہ غریب کسی ٹیم میں کھلائے نہیں جاتے ہیں کہ ان کی صورت دیکھتے ہی مقابل ٹیم دُم دبا کر بھاگ جائے گی اور تماشائیوں کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے گا۔

ایک روز مقامی اسکول کے لڑکوں میں میچ ہو رہا تھا۔ اتفاق سے گھومتے پھرتے چھکا صاحب بھی پہنچ گئے اور حسب عادت لگے کرکٹ کے متعلق اپنی لن ترانیاں کرنے۔ یہ گیند یوں پھینکنی چاہئے تھی اور اس پر ایسے نہیں ایسے ہٹ لگانی چاہئے تھی۔ ایک لڑکا آوٹ ہوا تو چھکا صاحب نے بڑی شفقت سے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا بچّے تمہارے آوٹ ہونے کا مجھے ہرگز کوئی افسوس نہیں۔ کیوں کہ تم کھیل ہی بالکل اناپ شناپ رہے تھے۔ البتہ اس بات کا ضرور ملال ہے کہ جس گیند پر تم آوٹ ہوئے پورے میچ میں وہی گیند ایک ایسی تھی جس پر بڑی آسانی سے ایک دھواں دار چھکا لگایا جا سکتا تھا۔ لڑکا آوٹ ہونے سے یوں ہی جھنجھلایا ہوا تھا بُرا مان کر بول اٹھا۔ پیر و مرشد ذرا خود میدان میں آیئے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔ دریا کے باہر تو سب ہی تیراک ہوتے ہیں۔

چھکا صاحب پر نہ معلوم اس وقت کیا نحوست سوار تھی کہ بپھر گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، کوٹ اتار کر فوراً تیار ہو گئے اور لڑکے نے مخالف ٹیم کے کپتان سے اجازت لے کر مجمع کے پرجوش نعروں اور تالیوں کے درمیان بھجوا ہی تو دیا ان کو میدان میں۔

پہلی گیند آئی تو اس کو روکنے کی کوشش میں ان کے ساتھ ہی چھکا صاحب اپنا بیٹ لئے وکٹ پر منہ کے بل گر پڑے۔ امپائر نے آوٹ دے دیا۔

اور اپنی گردن جھاڑتے ہوئے چھکا صاحب لیٹے ہی لیٹے چیخے۔ ناٹ آوٹ

تماشائیوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا اور سب نے چھکا صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ناٹ آوٹ۔ امپائر نے بھی پیٹ پکڑ کر قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

دوسری گیند آئی تو چھکا صاحب قلابازی کھا کر وکٹ کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئے اور گیند پوری قوت سے ان کی کنپٹی پر لگتی ہوئی وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں جا رکی۔ مختلف لوگ مختلف آوازیں لگا رہے تھے۔ امپائر نے ہنستے ہوئے ناٹ آوٹ دیا۔

تیسری گیند آئی تو چھکا صاحب نے آنکھ بند کر کے گھما ہی تو دیا بیٹ۔ بیچ کا وکٹ اکھڑ کر دو میٹر

دور جاگرا۔ لیکن چھکا صاحب کا بیٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں پرواز کر رہا تھا اور کئی کھلاڑی اس کو کیچ کرنے کے لئے ہاتھ پھیلائے دوڑ رہے تھے۔ امپائر پھر چیخا نٹ آؤٹ اور سارا مجمع ہنستے ہنستے اور تالیاں بجاتے بجاتے پاگل ہوا جارہا تھا۔

چوتھی گیند واقعی بڑی خطرناک تھی۔ چھکّا صاحب کی کھوپڑی محض اتفاق سے بچ گئی لیکن بے چارے کے تینوں وکٹ جاتے رہے۔ امپائر پھر چیخا۔ اب بھی نٹ آؤٹ۔ لیکن چھکّا صاحب خود فیلڈ سے بھاگتے ہوئے گرجے۔ ابے صاف آؤٹ ہو چکا ہوں۔ کیا میری کھوپڑی پھڑوائے گا۔

مجمع نے چھکّا صاحب کا ایسا شاندار استقبال کیا جیسے وہ دو سو گیارہ رنز بنا کر نٹ آؤٹ لوٹ رہے ہوں۔

اس حادثے کے بعد چھکّا صاحب کا نام لڑکوں نے زیرو چچا رکھ دیا ہے۔ اب انہیں کرکٹ کے متعلق کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک گھر کے بھیدی نے اطلاع دی ہے کہ آج کل نقاد بن کر شاعروں اور ادیبوں کی پگڑیاں اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ میدان کرکٹ کے میدان سے کہیں زیادہ بڑا اور عبرت انگیز ہے۔

یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا۔ کہ ڈنڈے پہ ہاتھی کھڑا ہو گیا۔

پیراشوٹ کی کہانی

شاھنواز فاروقی

پیراشوٹ کی کہانی ہوا میں اڑتے ہوئے (DANDELiON) یعنی گگروندے کے بیج کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس بیج کے ساتھ ملائم بالوں کی ایک چھتری جڑی ہوئی تھی جس کی مدد سے اس بیج نے بڑے آرام سے زمین پر لینڈ کیا۔ آپ گگروندے کا نام سن کر چونک گئے ہوں گے۔ اس لئے کہ آپ نے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا ہو گا۔ آپ کی آسانی کے لئے ہم بتائے دیتے ہیں کہ یہ دراصل ایک زرد پھول ہوتا ہے جس کی پتیاں دانے دار ہوتی ہیں۔

انسان کو صدیوں تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس پھول کے بیج ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے پیراشوٹ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان نے جب اڑنے والے

غبارے اور اڑنے والی مشین پر تجربات شروع کئے تو بس اسی وقت اس کے ذہن میں پیراشوٹ بنانے کا خیال بھی آیا تھا۔ اس زمانے میں گیس سے اڑنے والے غباروں یا ہوائی جہازوں کے سفر کے دوران سب کے دلوں میں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان کو حادثہ پیش آگیا تو ان کا کیا بنے گا۔ اس زمانے میں جب بھی کسی ہوائی جہاز یا غبارے کو حادثہ پیش آتا اس میں سوار تمام لوگ ہلاک ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت لوگوں کو ایک ایسی شے کی ضرورت تھی جو حادثے کے بعد ان کو سلامتی کے ساتھ زمین پر اتار سکے۔

دنیا کا وہ پہلا پیراشوٹ جس کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے ۱۵۱۴ء دنیا کے عظیم مصور اور انجینئر لیونارڈو ڈونچی نے بنایا تھا۔ ڈونچی نے اس پیراشوٹ کا ایک خاکہ تیار کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھ چھوڑا کہ یہ پیراشوٹ کس طریقے سے عمل کرے گا۔

ڈونچی کی اس کوشش کے تقریباً تین سو برس بعد فرانس کے ایک شخص جوزف مانٹگولفر نے ایک چھوٹا سا گول پیراشوٹ تیار کیا۔ اس پیراشوٹ کے نیچے ایک باسکٹ لگی ہوئی تھی۔ تجربہ کے لئے اس نے اس باسکٹ میں ایک بھیڑ کو بٹھا کر ایک بلند ٹاور سے چھوڑ دیا۔ بھیڑ آہستہ روی کے ساتھ زمین پر صحیح سلامت اتر گئی۔ یہ وہی مانٹگولفر ہیں جنہوں نے اڑنے والا غبارہ ایجاد کیا تھا۔

فرانس کے دوسرے کئی افراد نے پیراشوٹ پر تجربے جاری رکھے۔ ۱۷۹۷ء میں گارنیرن نام کا ایک شخص پیراشوٹ پر تجربہ کرتے ہوئے پیراشوٹ سے گر پڑا مگر بچ گیا۔ گارنیرن کا پیراشوٹ آج کل کے پیراشوٹ سے کافی ملتا جلتا تھا۔ مثلاً یہ کپڑوں سے بنایا گیا تھا۔ اس کی شکل ایک کپ کی طرح تھی اور یہ فضا میں خود کار طریقے سے کھلتا تھا۔ پیرس میں اپنے پیراشوٹ کے مظاہرے کے بعد اس نے انگلینڈ میں مظاہرہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بار پیراشوٹ کو ایک ٹیوب جیسی شے میں تہہ کر کے رکھا گیا۔ اس کے نیچے ایک باسکٹ فٹ تھی اور اس پیراشوٹ کو ایک غبارے کے نیچے جوڑ دیا گیا تھا۔ لندن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس مظاہرہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی۔ چند لمحوں میں گرنیرن آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر جا پہنچا۔ پھر اس نے پیراشوٹ کو غبارے سے باندھنے والی رسی کاٹ دی۔ پیراشوٹ ہوا میں کھل گیا۔ اگرچہ وہ باسکٹ جس میں گرنیرن صاحب تھے ہوا میں پنڈولے کی طرح ادھر ادھر ہل رہی تھی مگر وہ بخیر وعافیت زمین پر اتر آئے۔ لوگوں نے گرنیرن کو گھیر لیا اور اس کو لے کر ایک جلوس کی صورت میں پورے لندن میں گشت کرتے پھرے۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں نے پیراشوٹ کو ترقی دینے کی کوششیں کی۔ بالآخر امریکہ کے ایک شخص بالدون نے سلک سے ایک پیراشوٹ بنایا۔ اس نے اس پیراشوٹ کے ذریعہ فضاء سے زمین پر کئی

چھلانگیں لگائیں۔ مگر ابھی تک پیراشوٹ کی یہ خرابی برقرار تھی کہ نیچے اترتے ہوئے ادھر ادھر ہلتا تھا۔ ایک روز بالدون اپنی ایک چھلانگ کے اختتام پر لوگوں سے بات چیت کر رہا تھا کہ ایک بچہ آگے آیا اور بولا۔

"سنیں! آپ اپنے پیراشوٹ کے سر پر ایک سوراخ کیوں نہیں بنا لیتے؟"

بچے کی یہ بات سن کر وہاں پر کھڑے ہوئے لوگوں نے زور دار قہقہہ لگایا۔ مگر بالدون نے کہا۔

"خیال تو تمہارا اچھا ہے بچے۔"

اور واقعی بچے نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ بالدون نے بعد میں اس مشورے پر عمل کیا تو یہ بات ثابت ہو گئی۔ اور پھر اس دن کے بعد سے بننے والے تمام پیراشوٹوں کے سروں پر ہوا کے دباؤ کے اخراج اور پیراشوٹ کی پرواز کو متوازن رکھنے کے لے ایک یا ایک سے زیادہ سوراخ بنائے جانے لگے۔

امریکی پیراشوٹ میں اگلا اضافہ بھی ایک امریکی کے ذریعہ ہوا۔ اس کا نام لیزلی اروِن تھا۔ لیزلی بعد میں اسکائی ہائی اروِن کے نام سے مشہور ہوا۔ اروِن نے جب پہلی مرتبہ غبارے کو فضا میں پرواز کرتے دیکھا تھا تو اس وقت سے ہی اسے فضا میں اڑنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ گیارہ برس کی عمر میں ہی اروِن نے کھلونا پیراشوٹوں اور گرم ہوا سے بھرے ہوئے غباروں کے ذریعہ فضا میں اڑنے کے تجربات شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز اس نے بہت عمدہ بات سوچی۔

"اگر گرم ہوا کے غبارے سے منسلک کر کے پیراشوٹ کو فضا میں بھیجا جائے تو کیسا رہے گا؟" اس نے اپنے دوستوں سے اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"جب فضا میں جا کر غبارے کی گرم ہوا سرد ہو جائے گی تو غبارہ اپنی قوت کھو دے گا اور پھر ہم دیکھ سکیں گے کہ پیراشوٹ فضا میں کس طرح کام کرتا ہے؟" اروِن نے کہا۔ اس کے دوستوں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا۔

"یہ عمل پیراشوٹ کو گھر کی چھت سے نیچے پھینکنے سے زیادہ دلچسپ اور مزیدار ہو گا۔"

تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایسا پیراشوٹ تیار کر لیا گیا جس کے نیچے ایک وزن لگا تھا اور اوپر ایک غبارہ۔ بالآخر ایک روز اروِن نے غبارے کو فضا میں اڑا دیا۔ غبارہ وزن کو لے کر فضا میں بلند ہوا۔ چند لمحوں تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا اور غبارہ مشرق کی طرف محو پرواز رہا۔ پھر اچانک ہوا تبدیل ہو گئی اور پیراشوٹ مغرب کی سمت اڑنے لگا۔

بہرحال اروِن نے اپنے تجربات جاری رکھے۔ وہ سترہ برس کا تھا کہ اسے ایک جہاز بنانے والی جگہ پر نوکری مل گئی۔ آنے والے برسوں میں اس نے پورے امریکہ میں تہلکہ مچا دیا۔ اس نے ہر اس کام میں حصہ لیا جس میں ایڈونچر تھا، جان کا خطرہ تھا۔ مثلاً کار ریس، غبارے سے چھلانگ لگانا،

ہوائی جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعہ چھلانگ لگانا۔

اس دوران ہوائی جہاز کی تیاری کے سلسلہ میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں جو ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی بہت سے ہوا باز اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت قابل اعتبار قسم کے پیراشوٹس ہوتے تو ان میں سے بہت سوں کی جانیں بچائی جاسکتی تھیں۔

جنگ کے اختتام کے بعد امریکہ نے تمام طرح کے پیراشوٹوں کے نمونے جمع کئے۔ اور دنیا کے تمام ممالک سے درخواست کی کہ ان کے یہاں جس طرح کے پیراشوٹس موجود ہوں ان کے نمونے امریکہ کو فراہم کئے جائیں۔

اس اپیل کے جواب میں امریکہ کو دنیا بھر سے بہت سے پیراشوٹوں کے نمونے موصول ہوئے۔ ان سب نمونوں میں سب سے عمدہ نمونہ اسکائی ہائی اِروِن کا تھا۔

اب تک جتنے بھی پیراشوٹس بنائے گئے تھے وہ خود کار طریقے سے کھلتے تھے۔ ان پیراشوٹوں میں ایک ڈوری یا رسی بندھی ہوتی تھی جو غبارے یا ہوائی جہاز سے پیراشوٹ کو منسلک کرتی تھی۔ یہ رسی کچھ اس طرح بندھی ہوتی تھی کہ گرتے ہوئے آدمی کا وزن رسی کو توڑ دیتا تھا۔ اور پیراشوٹ کھل جاتا تھا۔ اس صورت میں اگر ایک ہوائی جہاز کسی دوسرے ہوائی جہاز سے ٹکرا جاتا تھا یا بے قابو ہو جاتا تھا تو ڈوری الجھ جاتی تھی اور پائلٹ کے ہوائی جہاز سے کودنے میں رکاوٹ ڈالتی تھی۔ چنانچہ اس صورت میں پائلٹ کے لئے محفوظ ترین راہ یہی تھی کہ وہ اپنے پیراشوٹ کو فضا کے اندر خود کھولنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ماہرین کا اس امر پر اتفاق تھا کہ یہ ایک مناسب ترین بات ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ آسانی کے ساتھ ممکن ہے کہ پیراشوٹ کسی انسان کی پیٹھ کے ساتھ چھوٹی سی ڈوری کے ذریعہ بندھا ہو اور وہ شخص خود پیراشوٹ کو کھول سکے۔ لیکن اس تجربہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بلندی سے کودتے وقت انسان بے ہوش ہو جائے گا اور وہ اس قابل نہیں ہوگا کہ اپنا پیراشوٹ کھول سکے۔ تاہم اِروِن کا خیال تھا کہ انسان بے ہوش نہیں ہوگا۔ بہرحال یہ طے کرنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کوئی آدمی یہ تجربہ کر کے دکھائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں کون ڈالے۔

"یہ تجربہ میں کروں گا۔" اِروِن نے کہا۔

بالآخر اِروِن کو ایک ہوائی جہاز کے ذریعہ دو ہزار فٹ کی بلندی تک لے جایا گیا۔ اِروِن کی کمر پر ایک پیراشوٹ بندھا تھا۔ بہت سے لوگ نیچے کھڑے اِروِن کی چھلانگ کے منتظر تھے۔ ان کے چہروں سے خوف نمایاں تھا۔ مگر اِروِن نہایت پرسکون تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ کامیاب ہوگا۔ بالآخر اس نے ہوا

میں اپنا ہاتھ لہرایا۔ اور جہاز سے کود گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ نیچے آرہا تھا۔ نیچے کھڑے ہوئے لوگ اپنے دلوں کو تھامے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ارون بے ہوش ہو گیا ہے۔" کئی ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا۔ ارون اب تک ایک تہائی فاصلہ طے کر چکا تھا اور اس کا پیراشوٹ نہیں کھلا تھا۔

پھر اچانک پیراشوٹ کھل گیا۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ ہوا میں تیرتا ہوا زمین پر اتر آیا۔

آج بھی بہت سے پیراشوٹ ارون کے پیراشوٹ کی طرز پر بنے ہوئے ہیں۔ تاہم اب کچھ ایسے پیراشوٹوں پر بھی تجربے ہو رہے ہیں جو ایک گرتے ہوئے ہوائی جہاز کو آسانی کے ساتھ زمین پر اتار سکیں۔

آج کے جدید دور میں پیراشوٹس کئی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہنگامی صورتحال میں پیراشوٹوں کے ذریعہ کھانے پینے کی اشیاء دوائیاں اور اسی طرح کی دوسری اشیاء زمین پر پھینکی جاتی ہیں۔ اس طرح جب کسی جگہ پر زلزلہ، سیلاب یا اس طرح کی کسی فطری آفت کے باعث لوگوں کا زمینی رابطہ دوسروں سے کٹ جاتا ہے تو ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ کو بھی پیراشوٹوں کے ذریعہ ہی ایسی جگہوں پر اتارا جاتا ہے۔

ارون کے اس تجربے سے لے کر آج تک ہزاروں لوگ پیراشوٹوں کے ذریعے اپنی جانیں بچا چکے ہیں۔

پیراشوٹ کو استعمال کرنے کے بعد نہایت احتیاط سے پیک کیا جاتا ہے اور ہر ماہ اسے کھول کر دیکھا جاتا ہے کہ اسے کسی طرح کا کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ پہلے پیراشوٹ سلک سے بنائے جاتے تھے۔ مگر اب یہ نائیلون سے بھی بننے لگے ہیں۔ ایک پیراشوٹ میں عام طور پر ۸۰ میٹر نائیلون استعمال ہوتا ہے۔ اس ۸۰ میٹر نائیلون کو تقریباً ۳۰۰ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں باندھ دیا جاتا ہے۔ پیراشوٹ کا پورا دائرہ ۲۲ فٹ کا ہوتا ہے۔ پیراشوٹ میں نیچے کی جانب لٹکنے والی ڈوریوں کی تعداد ۲۲ ہوتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی لمبائی ۲۶ فٹ ہوتی ہے۔ ان ڈوریوں کو پیراشوٹ کے ساتھ اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ پیراشوٹ استعمال کرنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

آنکھ مچولی کو اپنی نگارشات ارسال کرنے والے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا نام اور مکمل پتا تحریر کے اختتام پر صاف اور خوش خط لکھا کریں۔ آئندہ سے جن مسودوں پر لکھنے والے کا نام نہیں ہوگا انھیں ضائع کر دیا جائے گا (ادارہ)

انڈے کو توڑنا ہے تو اس طرح توڑیئے

(شعبہ تحقیق و تلاش ماہنامہ آنکھ مچولی)

برنیبی روبی امریکہ کی قومی بومی رینگ ٹیم کے کیپٹن ہیں۔ انہیں اس کھیل پر کتنا عبور ہے؟ اس کا اندازہ ان تصاویر کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے سر پر انڈا چپکایا اور بومی رینگ کو اس طرح فضاء میں پھینک دیا کہ اس نے واپس آتے ہی انڈے کا نشانہ لیا اور اسے تڑاخ سے اڑا دیا۔ اسی مہارت کے باعث برنیبی روبی نے ۱۹۸۹ء کی عالمی چیمپئن شپ بھی جیت لی۔

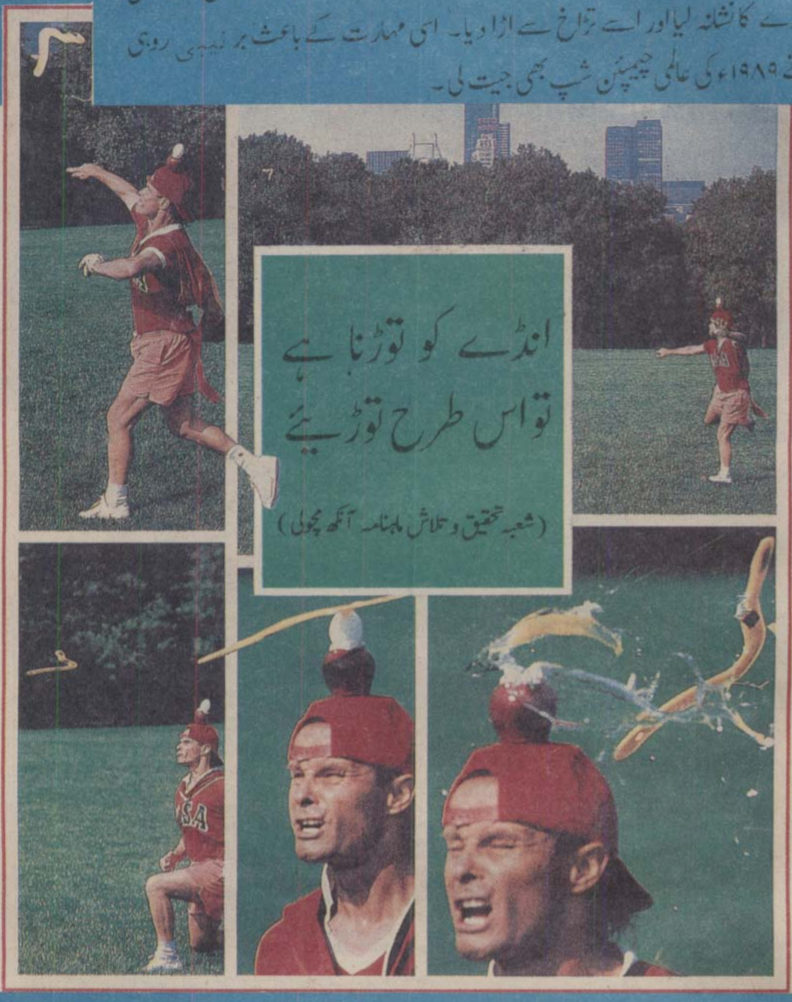

ہے نا حیرت کی بات؟

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار

قدسیہ ممتاز

بچو! کیا تم نے ایلس کو دیکھا؟ نہیں دیکھا! چلو میں تمہیں بتاتا ہوں وہ میری دوست تھی۔ ننھی سی پیاری دوست، بالکل تمہاری طرح۔ اگر تم اسے دیکھتے تو تمہیں یقیناً کسی فرشتے کا خیال آتا۔ وہ فرشتہ ہی تو تھی۔ اور فرشتے بھی کبھی مرتے ہیں؟ اس ننھی دوست کی کہانی بہت دردناک ہے۔ چلو میں تمہیں سناتا ہوں اگر تم میں سننے کی تاب ہو۔

جب بھی تم کسی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی بچی کو دیکھو تو مجھے یقین ہے وہ میری ایلس ہی ہوگی۔ اس کے خوبصورت سنہری بال جو اس کے ننھے ننھے شانوں پر لہراتے تھے۔ نیلی نیلی آنکھیں بالکل جنت کی کسی جھیل جیسی۔ جس میں معصومیت کی لہریں گردش کرتی تھیں۔ سرخ سرخ گال جو اس کی صحت کی نشانی تھے۔ ہاں تو وہ ننھی ایلس، اسے تتلیوں اور پھولوں اور تاروں سے بہت پیار تھا۔ تمہیں بھی ہوگا۔

ہے ناں! وہ باغ میں بیٹھ کر گھنٹوں تتلیوں اور پھولوں سے باتیں کرتی۔ پھر جب وہ تھک جاتی تو وہیں سو جاتی۔ اور مجھے لگتا جیسے چڑیاں اس کو لوری سنا رہی ہوں۔

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار

اور دور کہیں ننھا سا تارا خوشی سے جھوم اٹھتا۔

اب تم سوچتے ہو گے کہ میں یہ سب کیسے دیکھتا۔ تو بچو! اس کے لئے تصور کی آنکھ چاہئے مگر میں یہ سب چھپ کر دیکھتا تھا۔

ان دنوں میں فلسفہ کا طالب علم تھا۔ بس ان ہی دنوں مجھے ایلس سڑک پر روتی نظر آئی تھی۔ میں نے اسے سڑک بھی پار کروائی اور چاکلیٹ بھی دی۔

پھر تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ اسی جگہ ملتی۔ میں اسے روز چاکلیٹ دیتا۔ ہماری دوستی مضبوط ہوتی گئی۔ وہ روز باغ میں پھول چنتے ہوئے مجھے ایک کہانی سناتی تھی۔ ایک ننھے سے تارے کی کہانی جو ننھی ایلس کی زبانی بہت اچھی لگتی۔ پھر وہ مجھے تاروں والی نظم بھی سناتی جو اس کو بہت پسند تھی۔ اسے تارے بھی تو بہت پسند تھے۔ پھر ہماری ان دیکھی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو دیر تک جاری رہتا۔ الغرض میری اور اس کی دوستی ایسی تھی جیسی چاند اور تاروں میں ہوتی ہے یا سمندر اور لہروں میں ہوتی ہے۔

مگر ایک دن آسمان پھٹ پڑا اور زمین شق ہو گئی شاید کسی کو بھی ایسا نہ محسوس ہوا ہو۔ مگر میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ تم پوچھو گے کیا ہوا؟ تو سنو!

اس روز میں اور ایلس باغ میں بیٹھے تھے اگلے دن میرا بہت اہم امتحان تھا۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ ایلس مجھے اس روز امتحان میں ڈال جائے گی۔ رات کا وقت تھا میں لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہا تھا وہ مجھے تنگ کرتی رہی، میں اسے ٹالتا رہا۔ ہنس کر، ڈانٹ کر مگر پھر اس نے حد ہی کر دی۔ مجھ سے ضد کرنے لگی کہ میں اسے تاروں کے پاس لے چلوں! میں ایسا کر تو نہیں سکتا تھا ناں بچو! کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ضد میں آکر اس نے لالٹین توڑ دی۔ جس کی روشنی میں میں پڑھ رہا تھا اس حرکت پر میں نے اسے گھورا اور پھر میرا مضبوط لوہے جیسا ہاتھ اس کے پھول سے گال پر پڑا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مگر مجھ سنگدل کو اب بھی شرمندگی نہ ہوئی۔ ایلس نے مجھ سے چیخ کر کہا تھا۔ "میں اس تارے کو ضرور پکڑوں گی۔" دوسرے ہی لمحے وہ اٹھی اور اندھیری رات میں اس کالی سڑک کے دوسری جانب چمکتے حسین تارے کو پکڑنے کے لئے بھاگی۔

میں اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ تو دیوانی تھی...... ہر حسین چیز کی! وہ بھاگتی رہی اس تارے کے پیچھے جو کبھی اس کے ہاتھ نہ آنے والا تھا۔ میں نے اس کو بہت روکا مگر وہ تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھی اور ہوا بھی

کہیں کہنے سے رکتی ہے؟ پھر تو میں نے اس کے خون کی سرخی ہی دیکھی تھی۔ ایک بھاری بھرکم ظالم ٹرک اس کو روندتا ہوا گذر گیا تھا۔ میں بھاگتا ہی رہا۔ اس کی لاش سڑک کے کنارے پر پڑی تھی۔ بس بچو! اب میں شاید تمہیں آگے نہ سنا سکوں! اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میری آخری دوست تھی۔ اس کے بعد مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔

اب نہ تو چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ نہ تارے گنگناتے ہیں۔ نہ تتلیاں اپنے رنگ فضا میں بکھیرتی ہیں۔ وہ باغ بالکل خاموش ہے .... میری طرح۔ بس کبھی کبھی کوئی کوئل کوک کر مجھے بتاتی ہے کہ وہ بھی میرے غم میں شریک ہے۔ اب کسی تارے کی صدا سنائی نہیں دیتی۔

ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار

تم میری آنکھوں میں جھلملاتے تارے دیکھ سکتے ہو۔ جو اب میرا مقدر بن چکے ہیں۔ تمہیں ان میں ایلس کا عکس صاف نظر آئے گا۔

بس بچو! اب میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ سوائے اس کے کہ کسی پر بلاوجہ غصہ نہ کرو۔ بدترین حالات میں بھی خود پر قابو رکھو۔ بچوں کو بہلانا سیکھو کہ کہیں تم بھی کسی ایلس سے محروم نہ ہو جاؤ۔ اور کہیں میری طرح تمہارا مقدر بھی آنسو نہ بن جائیں۔

جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبت کیجیے اس کا خیال رکھیے

ڈنڈا ڈولی

۱۰۱ واں کا موضوع

"کھلاڑی"

ان صفحات میں ہم ہر ماہ کسی ایک موضوع کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کرتے ہیں۔
جنوری کے خاص نمبر کے لیئے موضوع ہے "بچے"

انعامی لطیفہ

انڈیا سے کھیل کر جب ٹیم وطن واپس پہنچی۔ تو اخبار نویسوں نے ٹیم کو ائیر پورٹ پر گھیر لیا۔ اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
نذیر صاحب، ہم نے اس میچ میں ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ جب بھی کپل دیو آپ کو بالنگ کرانے آئے تو آپ سہم سے گئے۔ (نذیر مسکرا کر۔) اس میں پوچھنے والی کونسی خاص بات ہے۔ بھئی کہیں دیو اور انسان کا مقابلہ بھی ہوا ہے؟

روبینہ پروین۔ کراچی

○ ..... ایک دوست (دوسرے سے) خدا کی قسم آج میچ میں مزا آگیا۔ دوسرا۔ ایسی کیا بات تھی میچ میں۔؟
پہلا۔ ارے تمہیں نہیں پتہ؟ میانداد نے ڈبل سنچری بنائی تھی۔
دوسرا۔ خیر اس بات کو چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ تم نے یہ خواب کتنے بجے دیکھا تھا۔

جنید اختر۔ کراچی

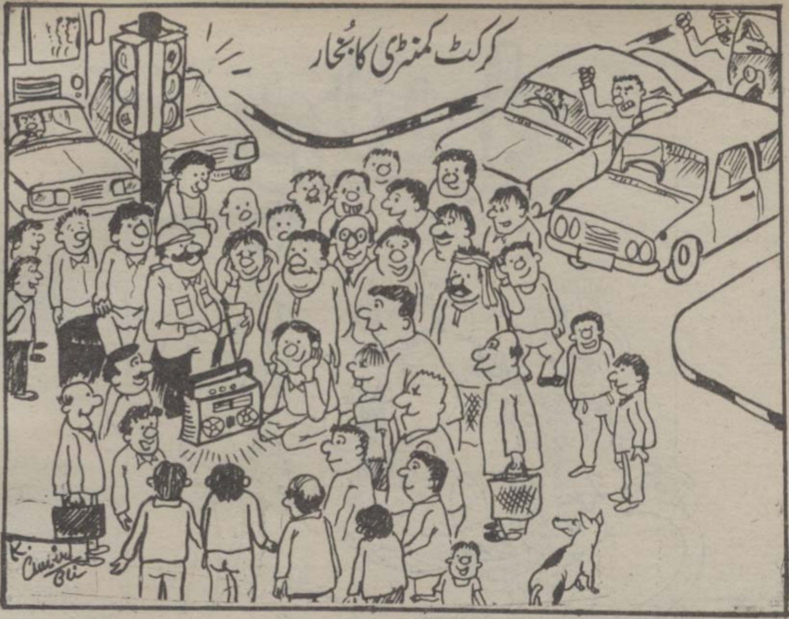

ایک بزرگ نے فٹ بال کے ایک کھلاڑی کو یہ خوشخبری سنائی کہ مرنے کے بعد وہ جنت میں جائے گا۔ نوجوان خوش ہو کر بولا "حضور یہ بھی بتا دیں، کیا جنت میں فٹ بال کے کھیل کا انتظام ہو گا؟"

بزرگ نے کہا "یہ جاننے کے لئے مجھے مراقبہ کرنا ہو گا تم شام کو آنا۔ اس وقت میں تمہارے سوال کا جواب نہ دے سکوں گا۔" شام کو جب کھلاڑی حاضر ہوا تو بزرگ کہنے لگے "نوجوان تمہارے لئے ایک اچھی خبر اور ایک بُری خبر ہے۔ اچھی خبر یہ کہ جنت میں کھیل کا انتظام موجود ہے اور بُری خبر یہ ہے کہ تمہیں کل وہاں ایک میچ میں حصہ لینا ہے"

درثمین یوسف۔ کراچی

کرکٹر۔ (مریض نرس سے۔) "میرا ٹمپریچر کیا ہے؟"

نرس۔ ٹھیک سو دو۔

کرکٹر مریض۔ بہت خوب یعنی ایک سنیچری اور دو رنز۔

نرس۔ ہاں! لیکن ابھی ہم آپ کو آؤٹ نہیں کریں گے۔

احمد رضا قریشی۔ لاہور

کھلاڑی (نوکر سے) میرا بیٹ کہاں ہے؟

نوکر۔ چوری ہو گیا۔ صاحب۔

کھلاڑی۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔؟

نوکر۔ آپ نے کہا تھا کہ چغل خوری بُری بات ہے۔

احمد علی خان۔ کراچی

ایک صاحب نے اپنے ملازم کو کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ "اوہو تم نے تو یہ کہہ کر چھٹی لی تھی کہ تمہیں اپنے چچا کو دیکھنے اسپتال جانا ہے"؟

"جناب یہ بات سچ بھی ہو سکتی ہے۔" ملازم نے کہا۔ "کیونکہ میرے چچا اس میچ کے ایمپائر ہیں۔

سید سہیل علی۔ کراچی

عمران خان لندن میں پوری ٹیم کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پندرہویں منزل پر انہیں کمرہ ملا تھا رات کے وقت چونکہ لفٹ بند تھی اس لئے سب کو سیڑھیاں چڑھنا دشوار نظر آرہا تھا۔

لہٰذا یہ طے ہوا کہ ہر کھلاڑی ایک ایک منزل پر ایک لطیفہ سنائے تاکہ وقت کٹ جائے اور اوپر پہنچ جائیں۔ دسویں منزل تک پہنچتے پہنچتے دس کھلاڑیوں نے لطیفے سنا دیئے۔

عمران :۔ (عبدالقادر سے) بھئی عبدالقادر اب تمہاری باری ہے۔ جلدی سے شروع ہو جاؤ۔ تاکہ یہ بقیہ منزلیں بھی طے ہو جائیں۔

(عبدالقادر۔ ہانپتے ہوئے) یار اب اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ کمرے کی چابی تو نیچے کاؤنٹر پر ہی رہ گئی ہے۔

سید محمد نثار۔ کراچی

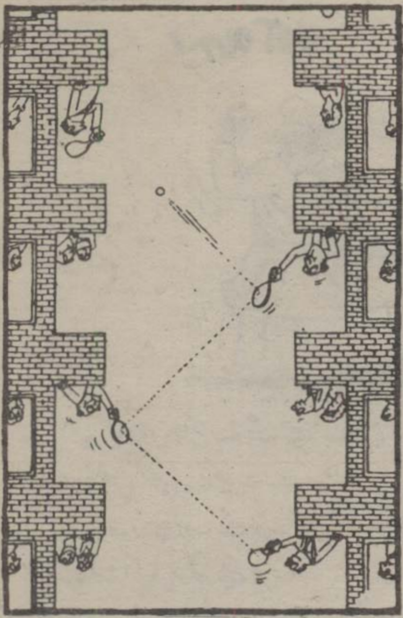

تنگ نلیٹوں میں کھیل کا سماں

استاد۔ بتاؤ رشید! بیٹسمین اور بولر کسے کہتے ہیں۔

شاگرد۔ سر بیٹسمین باٹا کے جوتے پہننے والے کو اور بولر زیادہ بولنے والے کو۔

یاسر بن صغیر۔ کراچی

○ ..... ایک شخص نے اپنے کھلاڑی دوست سے پوچھا۔

"کیوں یار حمید کیا بات ہے آج تم بہت رنجیدہ دکھائی دے رہے ہو۔ کھلاڑی نے آہ بھر...

" یار کیا بتاؤں ڈاکٹر نے مجھے کھیلنے سے منع کر دیا ہے۔" اس شخص نے حیرت سے کہا،
" سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب تمہارا کھیل دیکھ چکے ہیں۔

روبینہ ناز۔ مخدوم پور پہوڑاں

○ ...... ایک دیہاتی کا گدھا شہر میں آ کر ایک جگہ رک گیا۔ دیہاتی نے اسے چلانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر گدھا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ دیہاتی نے اسے مارنا شروع کر دیا۔
اتنے میں ایک دوسرا دیہاتی ہاتھ میں ریڈیو لٹکائے قریب سے گزرا تو ریڈیو سے آواز آئی۔
" سعید انور نے سنچری پوری کر لی۔ "
گدھے نے جو یہ سنا تو آگے چل دیا۔
دیہاتی کہنے لگا، اب کل سے میں بھی ریڈیو ساتھ رکھوں گا۔ اب میں سمجھا اسے کرکٹ کا شوق ہے۔

یاسمین ناز۔ کراچی

○ ...... ماں (بیٹے سے) تو میرے کہنے پر عمل نہیں کرتا۔ یاد رکھ میں تجھے سخت سزا دوں گی۔
بیٹا (معصومیت سے) ماں ایسی کون سی سزا دو گی؟
ماں۔ میں تجھے کرکٹ کا کھلاڑی بنا دوں گی اور تو ساری زندگی دھوپ میں جلتا رہے گا۔

ریحانہ شکیل۔ کراچی

○ ...... ماسٹر صاحب نے اسکول میں بچوں سے سوال کیا۔
" بتاؤ بچو بوتھم کا کیا مطلب ہے۔
ایک بچہ:۔ جناب یہ لفظ پنجابی اور فارسی سے مل کر بنا ہے۔ پنجابی میں بوتھا، کہتے ہیں چہرے کو اور فارسی میں " م " کا مطلب ہوتا ہے۔ میرا۔ اس لئے بوتھم کا مطلب ہے۔ " میرا بوتھا۔ "

حارث بن صغیر۔ کراچی۔

جھوٹ موٹ پاکستان

محمد سلیم مغل

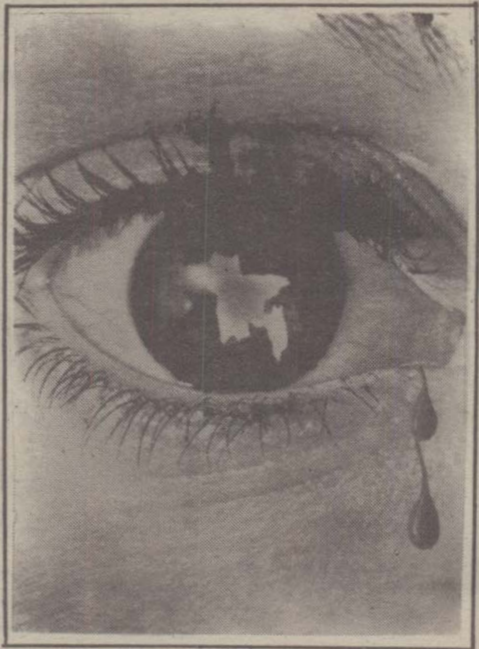

اس مصروف شہر میں کس کے پاس اتنی فرصت کہ وہ ہر ہفتے گھومنے پھرنے کے لئے وقت نکالے، مگر ہم نے ایک عادت سی بنالی ہے کہ جب کبھی بچوں سے سیر و تفریح کا کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اسے پورا کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کرتے ہیں۔ آج دفتر جاتے ہوئے بچوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ شام کو واپسی پر کلفٹن چلیں گے۔ میں شام کو جلدی گھر آگیا اور بچوں کے ساتھ کلفٹن چل دیا۔

میں نے ہما کو کئی بار سمجھایا ہے کہ جب گھومنے پھرنے کے ارادے سے کہیں نکلیں تو پڑھنے لکھنے کی اور دفتر کی باتیں مجھے یاد نہ دلایا کرے مگر میرے بگڑے ہوئے معمولات پہ پریشان رہنے والی یہ خاتون کبھی باز

نہیں آتی اور موقع بے موقع مجھے میرے التواء میں پڑے ہوئے کام یاد دلاتی رہتی ہے۔ کلفٹن کے لئے گھر سے نکلتے ہوئے جو بات سب سے پہلے ہما کی زبان پر آئی وہ یہی تھی۔

"آج دسمبر کی ۱۶ تاریخ ہو گئی ہے مگر آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔" ہما نے میری توجہ اس مضمون کی جانب مبذول کروائی جو مجھے اب تک لکھ لینا چاہئے تھا مگر محض اپنی کاہلی کے باعث نصف سے زیادہ مہینہ گزرنے پر بھی مکمل نہیں کر سکا تھا۔ میں نے ہما کی بات کو پوری توجہ سے سنا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ شاید یہ فرار کی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت عموماً اس وقت ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ سے نادم سا ہو، اور اس کے پاس اپنی کوتاہیوں کے لئے کوئی معقول جواز بھی نہ ہو۔

ہما کی بات گو میں نے سنی ان سنی کر دی مگر اس کے منہ سے "۱۶ دسمبر" کا سن کر میں ایسے چونکا جیسے یہ کوئی بہت ہی اہم تاریخ ہو...... ۱۶ دسمبر...... ۱۶ دسمبر...... میں بہت دیر تک سوچتا رہا مگر مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ تاریخ کس حوالے سے اہم ہے...... اور آیا اہم ہے بھی کہ نہیں۔ ؟

مجھے یاد آیا کہ ہما کے ابو کی تاریخ پیدائش بھی تو دسمبر ہی کی ہے۔ میں نے اپنی الجھن دور کرنے کے لئے پوچھ ہی لیا...... کیا ابو ۱۶ دسمبر کو پیدا ہوئے تھے؟

جی نہیں! ابو کی ڈیٹ آف برتھ ۲۵ دسمبر ہے۔ ہما نے میری تصحیح کی۔

"مگر ۲۵ دسمبر تو قائد اعظم کی سالگرہ کا دن ہے۔ ؟؟"

تو کیا ۲۵ دسمبر کو کوئی اور پیدا نہیں ہو سکتا...... ؟؟"

ہاں! ہو تو سکتا ہے میں نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میرے منہ سے "سالگرہ" کا لفظ سن کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اسامہ اور رمیصاء دونوں ہی چونکے اور لپک کر ہمارے قریب آگئے۔

آج کس کی سالگرہ ہے ابو؟ دونوں نے تقریباً کورس کے انداز میں پوچھا۔

کسی کی نہیں بیٹا۔ میں نے انہیں ٹالنا چاہا مگر سالگرہ کا ذکر آنے کے بعد انہیں ٹال دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سالگرہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور کیک کاٹنا ان کا من بھاتا مشغلہ۔ ابھی ان دونوں بھائی بہنوں کی عمریں پانچ اور چار سال سے زیادہ نہ ہوں گی مگر ان چار پانچ برسوں میں یہ ایک دوسرے کی پچاس سے زیادہ سالگرہ منا چکے ہوں گے۔ یہ دونوں کسی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کر لیں یا سالگرہ کا ذکر بھی سن لیں تو پھر ان کی سالگرہ منانی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر کیک دستیاب نہ ہو تو ڈبل روٹی کاٹ کر تالیاں بجانا، ہمیں اپنی تالیوں میں شریک کرنا، خوش ہونا، اور بہت دیر تک ہیپی برتھ ڈے گاتے رہنا

ان کی ایسی عادت ہے جو جنون کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

بچوں نے ایک بار پھر سوال کیا۔ ابو آج کس کی سالگرہ ہے۔ ؟اس بار میں نے اس سوال کے جواب میں انہیں سمجھا دیا کہ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا......

باتیں کرتے کرتے ہم اپنے گھر سے کلفٹن تک کا آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اس سفر میں ہمارا موضوع ۱۶ دسمبر ہی رہا...... ۱۶ دسمبر کی گتھی کسی طرح سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔ ہُمأ کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے اس تاریخ کی اہمیت معلوم ہے مگر وہ مجھے بتانے کے بجائے چاہتی ہے کہ میں اپنی یادداشت کی بنیاد پر اس معمے کو حل کروں۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر پچھتاوے کا ایک عجیب سا تاثر بھی تھا، جیسے وہ آج کے دن تفریح کے اس پروگرام پر بادل نخواستہ تیار ہوئی ہو۔

اچھا ایسا کرتے ہیں کسوٹی کھیل لیتے ہیں۔ میں نے تجویز پیش کی۔ تو یہ طے پایا گیا کہ میں ۲۰ سوال پوچھوں گا اور تم ہاں یا نہیں میں جواب دو گی۔

ٹھیک ہے۔ ہُما کسوٹی کھیلنے کے لئے تیار تھی اور میں ۱۶ دسمبر کی گتھی سلجھانے کے لئے بے چین۔ ہمارے دونوں بچے ہماری باتوں کو نہ سمجھتے ہوئے بھی اس طرح ہماری طرف متوجہ تھے جیسے ہم انہی کے مطلب کی کوئی بہت دلچسپ بات کر رہے ہوں۔

میں نے پہلا سوال کیا۔ ۱۶ دسمبر جس کسی سے بھی متعلق ہے کیا وہ زندہ ہے؟...... میرے سوال کے جواب میں ہُمأ نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں درست جواب سے کوسوں دور ہوں پھر ہاں یا نہیں کہنے کے بجائے بولی

"کم از کم آپ کے اور ہمارے لئے تو مر چکا ہے۔"

یہ بڑا معنی خیز جواب تھا اور مجھ پر اس کا پہلا تاثر یہی تھا کہ میں غلط ٹریک پر سوچ رہا ہوں اور پھر اگلے ہی لمحے جواب بھی سمجھ میں آگیا......

میرا سر شرمندگی سے جھک گیا...... اتنی اہم تاریخ مجھے کیوں یاد نہیں رہی...... ؟؟ آج یوم سقوط مشرقی پاکستان تھا۔ میں نے سوال بوجھ لیا...... کسوٹی کے پہلے سوال پر ہی میں نے جواب بتا دیا تھا مگر سچ یہ ہے کہ میں یہ کھیل ہار گیا تھا...... اتنے اہم دن کو میں کیوں یاد نہ رکھ سکا...... ؟؟ میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا......

اس عرصے میں ہم کلفٹن پہنچ چکے تھے۔ بچے ابھی تک ہماری باتوں کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔

پاکستان بننے اور پاکستان ٹوٹنے کی سبھی باتیں انہوں نے غور سے سنیں اور شاید یہ باتیں ان کے ذہن میں کہیں محفوظ رہ گئیں......

جب انسان اپنے اندر سے خوش نہ ہو تو حسین مناظر بھی اس کا دل نہیں بہلا سکتے۔ یوم سقوط مشرقی پاکستان کے احساس نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا تھا اور شاید اسی لئے ہمیں کلفٹن کا ساحل بھی اداس اداس سا نظر آ رہا تھا۔ ہم نے تفریح کے لیے آج ہی کا دن آخر کیوں منتخب کیا۔ ؟ میں نے ساحل پر پڑے پتھروں پر بیٹھتے ہوئے ہُماؔ سے کہا۔ میرے لہجے میں افسردگی بھی تھی اور خود اپنے آپ سے احتجاج بھی۔ ہمیں اس تاریخ کا احساس پہلے سے ہو جاتا تو کبھی نہ آتے۔ ہُماؔ نے جواباً کہا۔

اسامہ اور رمیصاء ریتیلے ساحل پر بھاگنے دوڑنے لگے، اور ہم دور بیٹھے انہیں دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بچوں نے ایک بڑا سا گھروندا بنایا...... وہ گھروندا بناتے ہوئے چیخ چیخ کر ہم سے کہتے...... "امی ابو ہم پاکستان بنا رہے ہیں...... دیکھئے ابو ہم نے کتنا اچھا پاکستان بنایا۔ ؟"

تھوڑی ہی دیر میں ایک موج آئی اور ان کے گھروندے کو توڑ گئی۔ دونوں بچے روتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے...... انہیں اپنا گھروندا ٹوٹنے کا بہت ملال تھا......

رمیصاء ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی...... "ابو سمندر گندا ہے، سمندر نے ہمارا پاکستان توڑ دیا"

یہ میری چار سالہ بچی کے منہ سے نکلا ہوا ایک بے ساختہ جملہ تھا جو نہ جانے کیوں دل کی گہرائیوں تک اتر گیا اور روح تک کو مجروح کر گیا۔ "ابو سمندر گندا ہے، سمندر نے ہمارا پاکستان توڑ دیا۔" میں اس کی اس معصوم بات کا بھلا کیا جواب دیتا۔ ہُماؔ نے دوپٹے کے پلو سے بچوں کے آنسو صاف کئے انہیں پیار کیا اور مجھ سے کہنے لگی۔

"ہم سے تو ہمارے بچے ہی اچھے ہیں، جھوٹ موٹ کا پاکستان ٹوٹنے پر سچ مچ تو رو دیئے۔ ہماری آنکھ سے تو سچ مچ کا پاکستان ٹوٹنے پر بھی کوئی آنسو نہ ٹپکا۔"

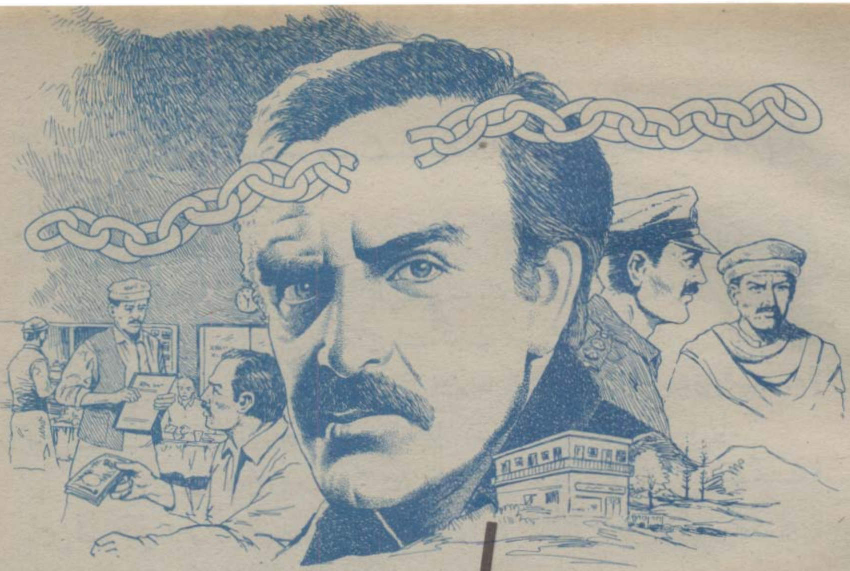

لمبا ہاتھ

منیر احمد راشد

وادی کاغان سے بیس میل اوپر اس چھوٹی مگر خوبصورت وادی میں واقع ہوٹل دلکشا کے سامنے ایک سرخ پجیرو جیپ آکر رکی۔ اس میں سے ایک خوش شکل اور خوش لباس آدمی اترا اور ادھر ادھر نظر ڈالتا ہوا مین گیٹ سے گزر کر کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اس کے چلنے کا انداز اور چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ ایک سخت مزاج آدمی ہے۔ کاؤنٹر پر اس نے اپنا نام سیٹھ حبیب کراچی والا لکھوایا۔ ضروری اندراج کے بعد ایک سروس بوائے نے سیٹھ صاحب کو ان کے کمرے تک پہنچا دیا۔

ہوٹل کا مالک اسے دیکھ کر بہت خوش تھا کہ ایک موٹی اسامی پھنسی ہے۔

سیٹھ صاحب کو کمرے میں گئے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ چیختے چلاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف آتے نظر آئے۔ ان کے آگے آگے وہ لڑکا بدحواسی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا جو ان کا سامان چھوڑنے

گیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ سیٹھ صاحب نے کاؤنٹر پر آکر زور سے ہاتھ مارا اور چیخ کر بولے ،

"یہ بالکل بکواس ہوٹل ہے .... کمرہ دیکھو .... کسی بھنگی کی کوٹھڑی معلوم ہوتا ہے۔ ہم سیٹھ حبیب کراچی والا ہیں۔ کراچی ، حیدر آباد ، نیویارک ، لندن میں ہماری بڑی بڑی فیکٹریاں اور بنگلے ہیں۔ ہمارا بنک بیلنس اربوں میں ہے اور تم ہمیں ایسے گندے کمرے میں رکھتے ہو........... ہم یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتے۔ ہم جارہے ہیں........... " سیٹھ صاحب چیختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے تو ہوٹل کے مالک نے لپک کر انہیں سے معذرت کی اور ہزار منت خوشامد سے انہیں روک ہی لیا۔

"ہمارے لئے کھانا لگا دیا جائے۔" سیٹھ صاحب نے تھوڑی دیر بعد حکم دیا۔ وقت کھانے کا نہیں تھا۔ لیکن سیٹھ کو خوش کرنے کے لئے جو بھی موجود تھا فوراً حاضر کر دیا گیا۔ کھانا دیکھ کر سیٹھ صاحب کا پارہ ایک بار پھر آسمان پر پہنچ گیا۔

"یہ کیا ہے؟ تمہیں نہیں معلوم ہم سیٹھ حبیب کراچی والا ہیں۔ کراچی حیدر آباد ، نیویارک لندن میں ہمارے بنگلے ہیں۔ تم ہمیں جھوٹے برتنوں میں کھانا کھلاتے ہو۔" سیٹھ نے ہاتھ مار کر میز پر رکھے ہوئے سب برتن الٹ دیئے۔ ہال میں موجود تمام افراد کی توجہ اس عجیب و غریب شخص کی طرف تھی جو اپنے لباس سے تو معقول لگتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر عجیب وحشت تھی۔ خصوصاً اس کی آنکھوں کی خوفناک چمک دیکھنے والے پر لرزہ طاری کر دیتی تھی وہ ہاتھ لہرا لہرا کر اول فول بک رہا تھا .... اور ہوٹل کا مالک اس کے سامنے کھڑا اپنے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کاروباری مسکراہٹ سے اسے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلآخر کافی دیر کے بعد سیٹھ صاحب ذرا نرم ہوئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے انگلی کے اشارے سے منیجر کو اپنے اور زیادہ قریب ہونے کو کہا۔ ہونٹوں کو بھینچ کر اور آنکھوں کو سکیٹر کر تکبّر سے پوچھا۔"

"کتنی آمدنی ہو جاتی ہے تمہیں روزانہ؟"

"پانچ ہزار روپے۔" ہوٹل کے مالک نے اپنی طرف سے دوگنی آمدنی بتا کر گویا سیٹھ کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ سیٹھ نے فوراً کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پرس سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر بے پرواہی سے اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا "لو........... یہ رکھ لو........... اور سنو جب تک ہم یہاں قیام کریں گے تم کسی نئے یا پرانے گاہک سے کسی قسم کا کوئی پیسہ نہیں لوگے .... سمجھے .... نہ کھانے کا نہ رہنے کا........... جو بھی آئے گا ہمارا مہمان ہو گا اب تم جاؤ .... لیکن نہیں ....

ٹھہرو.......... سنو اب ہمیں جب بھی کھانا دو تو اس بات کا دھیان رکھو کہ ہم جس برتن میں ایک بار کھا لیتے ہیں اسے دوبارہ استعمال نہیں کرتے۔ ہر بار نئے برتن ہونے چاہئیں............ ٹھیک............ اب جاؤ۔" انہوں نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ ہوٹل کا مالک بے چارہ حیرت سے بت بنا کبھی سیٹھ صاحب کی صورت تکتا اور کبھی اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھتا............ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے............ "کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" اس نے سوچا لیکن ہال میں موجود بہت سے لوگوں کی پراسرار سرگوشیوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا۔ پھر وہ کرارے نوٹ جن کی گرمی کی وجہ سے اس سرد موسم میں بھی اس کی ہتھیلی پسینہ پسینہ ہو گئی تھی، اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ بیدار ہے۔ اس نے ایک بار پھر سیٹھ کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے، نظر اپنے جوتوں پر جمائے کسی گہری سوچ میں گم، ماحول سے بے نیاز نظر آرہا تھا۔ اس نے ہال میں چاروں طرف دیکھا۔ لوگ حیران اور متجسس نگاہوں سے کبھی سیٹھ کی طرف اور کبھی نوٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگوں کی آنکھوں میں ایک مسرت اور حیرت آمیز چمک تھی کیوں کہ انہوں نے سیٹھ صاحب کا یہ اعلان سن لیا تھا کہ ہوٹل میں موجود اور آئندہ آنے والا شخص ان کا مہمان ہے۔ بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ لیکن انہیں محسوس ہوا جیسے انہیں بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو سیٹھ کا یہ رویہ بہت بُرا محسوس ہوا۔

سیٹھ صاحب تھوڑی دیر وہاں رکے اور اس کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں نئے بستر اور نئے پردے لگا دیئے گئے تھے۔ شام تک یہ خبر ساری وادی میں پھیل گئی تھی کہ ہوٹل دلکشا میں کوئی سیٹھ حبیب کراچی والا آ کے رکے ہیں۔ اور تمام لوگوں کے کھانے اور رہنے کی اخراجات خود برداشت کر رہے ہیں۔ بات ایسی تھی کہ تمام سیاحوں اور اکثر مقامی لوگوں نے ہوٹل دلکشا کا رخ کیا۔ ایک میلہ سا لگ گیا۔ ہوٹل کے مالک نے بھی پانچ چھ لڑکوں کو ہنگامی ملازم رکھ لیا تھا۔ کھانے پینے کا سامان اور نئے برتنوں کے بہت سے سیٹ منگوا کر اسٹور کر لئے گئے۔ ڈائننگ ہال میں فرنیچر کا اضافہ کر دیا گیا۔ باورچی خانے میں آگ ہر وقت جلتی نظر آتی۔ ہوٹل کا مالک کاؤنٹر پر کھڑا احکامات صادر کرتا رہتا۔ وہ کبھی ہال کا چکر لگاتا اور کبھی باورچی خانے میں صورت حال کا جائزہ لیتا اور نئے احکامات جاری کرتا۔ وادی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ رات دس بجے کے بعد بھی لوگ ہوٹل پر ٹوٹے پڑتے دکھائی دیتے تھے۔ سب خوش تھے اور خاص طور پر ہوٹل کا مالک...... اسے یقین آگیا تھا کہ اللہ چھپر پھاڑ کر بھی دیتا ہے۔

........○ ○........ ○ ○........

آج سیٹھ کو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے چوتھا دن تھا۔ سیٹھ کے مہمان اسے دیکھنے کے لئے بے تاب

تھے لیکن عجیب بات تھی کہ سیٹھ صاحب پہلے دن کے بعد سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ ہوٹل کا مالک خود ان کا کھانا نئے برتنوں میں ان کے کمرے میں پہنچا دیتا تھا۔ ان کے درشت رویئے اور خوفناک آنکھوں کی وجہ سے اسے کبھی سیٹھ صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ ہوٹل لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور بے ہنگم سے شور کی وجہ سے کوئی بات صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ سب کو کھانے کی جلدی تھی۔ ہوٹل کے ملازم لڑکے بھاگ بھاگ کر ہر ایک آرڈر کی تعمیل کر رہے تھے۔

ہوٹل کا مالک بھی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا اپنے ایک دوست سے باتوں میں مصروف تھا......

"خوش قسمت ہو دوست۔ اب کے تو لمبا ہاتھ مارا ہے۔" دوست نے ہنس کر کہا۔

"بس اللہ نے ہی لکشمی میرے گھر بھیج دی ہے۔" ہوٹل کے مالک نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"یار کچھ عجیب سا نہیں لگتا؟" دوست نے شکی لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی مجھے تو ذرا بھی عجیب سا نہیں لگا۔ دولت والے ایسے ہی نہ سمجھ میں آنے والے ہوتے ہیں۔ ......نہ دیں تو حقدار کا بھی پیسہ مار لیں اور دینے پر آئیں تو لکھ لٹا دیں۔" دوست چپ ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سیٹھ بھی کسی پرانے نواب کی نئی شکل ہے۔

"ویسے اب تک کتنے پیسے لگا چکے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تیس ہزار روپے۔" ہوٹل کے مالک نے جواب دیا۔ "ساری وادی والے ادھر ہی آ نکلے ہیں۔ اس لئے خرچ بڑھ گیا ہے۔"

تھوڑی دیر دونوں اسی موضوع پر بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حالات حاضرہ کی طرف مڑ گیا۔ دوست نے ہوٹل کے مالک کو بتایا کہ وادی سے پندرہ میل دور ایک لاش ملی ہے۔ چار دن پہلے قتل ہوا تھا۔ لاش کی اطلاع ایک سیاح نے دی تھی۔

ابھی وہ لوگ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک پولیس انسپکٹر لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا کاؤنٹر کی طرف آیا۔ اس کے ساتھ دو اجنبی افراد تھے۔ جو اپنے حلیے سے ہی لگتے تھے کہ کسی میدانی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ انسپکٹر تجسس سے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے بھئی؟ ...... خوب مزے ہو رہے ہیں آجکل۔" انسپکٹر نے کاؤنٹر پر پہنچ کر مسکراتے ہوئے ہوٹل کے مالک کو مخاطب کیا۔ ہوٹل کا مالک عاجزی سے بولا۔"

"بس جی اللہ کی دین ہے۔" ویسے اسے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ انسپکٹر کو ابھی تک اصل

معاملے کی خبر نہیں ہے۔

"ہوں۔" انسپکٹر نے ایک بار پھر پورے ہال میں نظر دوڑائی اور مڑ کر ہوٹل کے مالک سے بولا۔ "خیر اسے تو بعد میں دیکھیں گے .... فی الحال تو ہم ایک اور کام سے آئے ہیں .... تمہیں معلوم ہے کہ چار دن پہلے ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس لاش کے لباس سے ملنے والے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کراچی کا کوئی بڑا امیر آدمی تھا۔ بچیرو گاڑی میں سوار سیر کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ مگر راستے میں کوئی اسے قتل کر کے اس کی گاڑی اور سامان لے بھاگا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ادھر ہی آیا ہو گا۔" انسپکٹر ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا .... پھر کہنے لگا۔

"اس سے تو میں نپٹ لوں گا .... تم پہلے ان کا کام کر دو ...." اس نے اپنے اجنبی ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا تعارف کروایا۔

"یہ کبیر صاحب ہیں .... لاہور میں خفیہ پولیس کے آفیسر .... اور یہ ڈاکٹر انور ہیں .... یہ بھی ایک شخص کی تلاش میں ہیں جس کے بارے میں شک ہے کہ شاید اس علاقے میں آیا ہو۔" ہوٹل کے مالک نے استفہامیہ نظروں سے کبیر صاحب کی طرف دیکھا جو پہلے ہی گھورتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کبیر صاحب اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئے۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگے۔

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ لاہور کے پاگل خانے سے ایک انتہائی خطرناک پاگل فرار ہو گیا ہے۔ اس نے گارڈ کو قتل کر دیا تھا .... ہمیں اطلاع ملی تو فوراً اس کی تلاش میں نکلے۔ ہمیں شک ہے کہ وہ بھی ادھر ہی آیا ہے۔" ہوٹل والا ہونقوں کی طرح منہ کھولے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

"پاگل؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں بے چارا پاگل ہے۔" اب کی بار ڈاکٹر انور نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "عام طور پر نارمل ہی لگتا ہے مگر جب دورہ پڑتا ہے تو چیخنے لگتا ہے کہ ہم سیٹھ حبیب کراچی والا ہیں۔ کراچی حیدر آباد، نیویارک، لندن میں ہماری بڑی بڑی فیکٹریاں اور بنگلے ہیں۔ ہمارا بنک بیلنس .... لیکن ڈاکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہوٹل کا مالک چکرا کر گرا اور کاؤنٹر کے پیچھے غائب ہو گیا۔ انسپکٹر فوراً جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا .... کبیر صاحب اور ڈاکٹر انور بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ہوٹل کے مالک کی بڑبڑاہٹ سنی جو کہہ رہا تھا۔ "ہائے میرے تیس ہزار .... ہائے .... ہائے

پھر اس کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا انسپکٹر نے حیرت سے کبیر اور ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ آتا بھی کیسے وہ تو چار دن سے وادی سے باہر تھے۔

گپے بڑے بڑے

شاہنواز فاروقی

اک دن کسی بلّی سے یہ کہنے لگا کُتّا
میں ایک زمانے میں ہُوا کرتا تھا بکرا
دس سینگ تھے، نو کان تھے، چھ پاؤں تھے میرے
رہتے تھے مِری ناک میں چھبیس لٹیرے
بکروں کی ریاست میں بڑا رعب تھا میرا
ہوتی تھی مِرے حکم سے رات اور سویرا
شیروں سے ملاقات رہا کرتی تھی اکثر
دھو دھو کے مِرے پاؤں پیا کرتے تھے بندر
میں نے کئی بگڑے ہوئے ہاتھی کیئے سیدھے
کہتے تھے مری شان میں لنگور قصیدے
تعمیر ہوا کرتی تھی پھولوں سے سواری
خوشبو سے سِلا کرتی تھی پوشاک ہماری
آتی تھیں مِرے واسطے، جنّت سے غذائیں
چلتی تھیں مرے واسطے رنگیں ہوائیں
بلّی نے سنی بات جو کتّے کی تو بولی
حضرت کسی نادان کو دیجیے گا یہ گولی
باتوں سے مجھے آپ کی اندازہ ہُوا ہے
جو آپ کا مالک ہے وہ گپ باز بڑا ہے
انسانوں میں گپ بازی کی عادت ہے بہت عام!
لیکن میاں، حیوانوں کو گپ بازی سے کیا کام؟
جو بات حقیقت میں ہو گندی وہی کہیئے!
بہتر ہے یہی بات کہ کتّے بنے رہیئے

بندر کینگرو

تلخیص و ترجمہ۔۔

اخگر انوار

کنگرو بندر کا بچہ گود سے ہاتھ نکال کر کچھ کھانے کو مانگ رہا ہے

بندر بھی آپ نے دیکھ رکھا ہو گا اور کینگرو کے متعلق بھی آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ کینگرو کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پیٹ پر تھیلی ہوتی ہے اور وہ اونچی جست لگاتا ہے۔ بندر کو درخت اور شاخوں پر اچھل پھاند کی وجہ سے "درختوں کا شہزادہ" کہتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی کسی ایسے کینگرو کا تصور کیا ہے۔ جو "درختوں کا شہزادہ" بھی ہو؟۔ اگر نہیں تو آج ہم آپ کو ایک ایسی ہی قسم کے کینگرو کی کہانی سناتے ہیں۔

شمالی آسٹریلیا کے مرطوب جنگلات میں پائے جانے والے اس جانور کا اصل نام ڈینڈرولے

گس لمہالزی (DENDROLAGUS LUMHOLTZI) ہے۔ عرف عام میں اسے بندر کینگرو کہہ سکتے ہیں۔ نسلی اعتبار سے یہ بندر کی نسبت کینگرو کے خاندان سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس میں پائی جانے والی بندروں کی سی خصوصیات اسے عام زمینی کینگرو سے ممتاز کرتی ہیں اور یہ ان جنگلات کے علاوہ دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ وزن اوسطاً ساڑھے آٹھ کلو ہوتا ہے۔ اور یہ زندگی کا نوے فیصد حصہ درختوں پر گزارتا ہے۔ اپنے زمینی ہم نسلوں کی طرح اس کی بھی پچھلی ٹانگیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ انہیں زمین پر اچھل کود کی بجائے درختوں پر جست بھرنے میں استعمال کرتا ہے۔

جب درخت پر چڑھنا ہوتا ہے تو بندر کینگرو تنے کے قریب کھڑا ہو کر پچھلی ٹانگوں پر اچھتا ہے اور تین چار فٹ بلندی سے تنے کو دونوں بازوؤں میں دبوچ لیتا ہے۔ اب یہ پاؤں کے تلوے اس انداز سے تنے کو لگا دیتا ہے کہ انگلیوں کا رخ اوپر کی طرف ہو۔ اس حالت میں تنے کے گرد بازوؤں کے حلقے کو آہستہ آہستہ اوپر کو کھسکاتا اور پاؤں کی مدد سے چلتا ہُوا اوپر بڑھتا ہے۔ (ملاحظہ کیجئے تصویر)

درختوں پر شاخوں اور پتوں کے سائبان میں اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بندروں سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ بندروں کی طرح شاخوں پر جھولا جھولنا یا لمبی لمبی چھلانگیں لگانا اس کے بس سے باہر ہے چنانچہ

چار انچ موٹی
شاخوں پر چلنے کے لئے یہ اپنے مضبوط پنجوں کو شاخ کے ساتھ چمٹا لیتا ہے اور اسی انداز میں ایک ایک پنجے کو آگے بڑھاتا ہوا چلتا ہے اور جہاں ٹھہرنا ہوتا ہے وہاں دوبارہ شاخ کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیتا ہے۔ چھوٹی اور لچکدار شاخوں پر اسے بڑی احتیاط اور سوچ بچار کے ساتھ حرکت کرنا پڑتی ہے۔ اس طرح ایک وقت میں ایک ہی ہاتھ یا ٹانگ آگے بڑھاتا ہوا چلتا ہے۔ اس دوران اگر کوئی لغزش اس کا توازن بگاڑ دے تو یہ گرتے وقت شاخوں کو بندروں کی طرح پنجوں میں دبوچ کر لٹک بھی سکتا ہے۔

عام طور پر بعض جانور مثلاً ریچھ اور شیر وغیرہ درخت سے اترتے وقت اپنا رخ زمین کی طرف رکھتے ہیں۔ لیکن بندر کینگرو درخت کے اوپر چڑھ رہا ہو یا نیچے اتر رہا ہو دونوں حالتوں میں اس کا رخ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ اگر بندر کینگرو کا پیچھا کیا جائے تو یہ نہ صرف اونچی اونچی جگہوں سے نیچے کی طرف چھلانگ لگا سکتا ہے۔ بلکہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر بھی جست بھر سکتا ہے۔ لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔

بندر کینگرو کی ایک اور خصوصیت اس کی کاہلی ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً پندرہ گھنٹے سو کر گزارتا ہے۔ پھر سونے کے لئے جگہ اور حالات کی کوئی قید نہیں۔ کسی بھی دو شاخے کے درمیان گول مول ہو کر پڑ جاتا ہے اور اس حالت میں گھنٹوں سوتا رہتا ہے۔ سونے کے علاوہ وہ اپنا وقت کھیل کود، گھومنے اور خوراک تلاش کرنے میں گزارتا ہے۔ زمین پر اترنے یا ایک درخت سے دوسرے درخت پر جانے کے لئے بندر کینگرو رات کے وقت کو ترجیح دیتے ہیں۔

کھانے کے معاملے میں بندر کینگرو بڑا اندیدہ واقع ہوا ہے۔ بعض دفعہ تو دن رات کچھ نہ کچھ چرتا ہی رہتا ہے۔ درختوں کے پھل پھول اور پتے اس کی خوراک ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس کی طبیعت میں سستی ہوتی ہے کیونکہ ماہرین کے نزدیک گھاس کھانے والے جانوروں کی نسبت پتے کھانے والے جانوروں کے جسم کو ضرورت سے کم غذائیت میسر آتی ہے۔ جوان کی طبیعت میں ڈھیلاپن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ بندر کینگروؤں میں مل جل کر رہنے کی عادت نہیں ہوتی۔ اکثر یہ آپ کو اکیلی حالت میں نظر آتے ہیں یا پھر کبھی دو بندر کینگرو اکٹھے بیٹھے نظر آبھی جائیں تو سمجھ لیجئے یا نر مادہ ہیں یا پھر ماں اور بچہ ہیں۔ اگر کسی درخت پر بہت سے کینگرو مقیم ہوں تو بھی وہ ایک دوسرے سے قطعی لاتعلق ہو کر آزادی سے کھاتے پیتے اور گھومتے پھرتے ہیں۔

بندر کینگرو کی زندگی کا سب سے دلچسپ پہلو اس کا اپنی اولاد کے ساتھ تعلق ہے۔ بندر کینگرو ماں کے پیٹ سے ابتدائی مرحلے پر ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی پیدائش کے وقت اس کی لمبائی ایک انچ سے کم ہوتی ہے۔ یہ پیدائش کے فوراً بعد

ماں کی مدد کے بغیر رینگ کر ماں کے پیٹ پر لگی ہوئی تھیلی میں جا گھستا ہے۔ ماں ایک وقت میں ایک ہی بچہ دیتی ہے۔ جو تھیلی میں داخل ہوتے ہی ماں کے تھن سے چمٹ جاتا ہے۔ اور اپنی باقی نشو نما تھیلی کے اندر ہی مکمل کرتا ہے۔

بچہ ایک عرصے تک تھیلی میں رہتا ہے اور اس دوران ماں اور بچہ ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ کینگرو کا بچہ (جسے انگریزی میں جوئی JOEY کہتے ہیں) اوسطاً ڈھائی سو دن بعد اس قابل ہوتا ہے کہ تھیلی سے باہر جھانک سکے۔ اس مرحلے پر وہ ماں کے کھانے پینے کے عمل کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور کچھ دنوں بعد تھیلی سے ہاتھ باہر نکال کر ماں سے کھانے پینے کی چیزیں طلب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ (ملاحظ کیجئے تصویر) بعض اوقات یہ ہاتھ نکال کر شرارت سے ماں کی ناک، گردن یا بازوؤں سے چھیڑ خانی کرتا ہے۔

تین سو دن کے بعد بچہ کبھی کبھار تھیلی سے باہر نکلنا شروع کر دیتا ہے۔ اور شاخوں پر ہلہ بول دیتا ہے۔ تاہم اس مرحلے پر بھی زیادہ تر وقت تھیلی میں سو کر گزارتا ہے۔ اس عمر کا بچہ شاخوں پر زیادہ سے زیادہ ایک ایک فٹ لمبی چھلانگیں لگا کر اپنی نقل و حرکت کا آغاز کرتا ہے۔ ادھر ادھر اچھلتے کودتے وقت بھی اس کی نظریں ماں کی تھیلی پر لگی ہوتی ہیں۔

مادہ بندر کینگرو بچے کی ان الٹی سیدھی بلکہ بعض اوقات خطرناک حرکتوں پر مطلق توجہ نہیں دیتی بلکہ اس کی کوشش اس دوران یہ رہتی ہے کہ بچہ کم سے کم تھیلی میں رہے۔ جب جوئی ماں کے قریب چھلانگیں لگا رہا ہوتا ہے اس کے ہاتھوں اور ناک سے چھیڑ خانی کر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ گول مول ہو کر اس انداز میں بیٹھتی ہے کہ تھیلی چھپ جاتی ہے۔ کچھ دیر اس حالت میں رہنے کے بعد وہ سیدھی بیٹھ جاتی ہے۔ جونہی بچہ آدھے کے قریب تھیلی میں داخل ہوجاتا ہے وہ ایک دم بے نیازی سے اٹھ جاتی ہے جس سے بچہ تھیلی سے باہر نکل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دراصل بچے کو عملی زندگی کی تربیت کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے جس میں بچے کو اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت دیتی ہے۔ بچہ اس تربیت

بندر کینگرو پتے کھاتے ہوئے۔

کے دوران بعض دفعہ ساٹھ پینسٹھ فٹ کی بلندی سے نیچے بھی گر جاتا ہے۔ لیکن اکثر اسے کوئی چوٹ نہیں لگتی۔

ساڑھے تین سو دن کی عمر تک پہنچنے پر وہ تھیلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

بندر کینگرو کا بچہ تھیلی کو خیرباد کہنے کے بعد بھی تقریباً پانچ سو پچھتّر دن کی عمر تک اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور اس دوران ماں بچہ اکٹھے گھومتے کھیلتے اور سوتے ہیں۔ لیکن یہ سوال کہ جوئی کس عم تک مکمل طور پر ماں کی جان چھوڑ دیتا ہے ابھی تحقیق طلب ہے کیونکہ ماہرین نے اب تک ایک ایسے جوئی کا مشاہدہ بھی کیا ہے جو ۶۷۰ دن کی [illegible] لینے کے باوجود اپنی ماں کے ساتھ نتھی تھا۔

●

بلّی چوہے میں اتنا پیار

کبھی دیکھا؟ کبھی سُنا؟

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

۶۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰، کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں

آنکھ مچولی بیرون ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

فطرت کی دُنیا

یہ کیڑے مکوڑے

شین فاروقی

کیڑے مکوڑے دنیا میں حیوانات کا سب سے بڑا گروہ ہیں۔ ان میں بھنورے، مکھیاں، شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، بھڑیں، تتلیاں، پتنگے، پسو اور دیمک وغیرہ شامل ہیں۔ دنیا میں اس وقت کیڑوں مکوڑوں کی تقریباً نو لاکھ اقسام پائی جاتی ہیں۔ یہ تعداد دنیا میں پائے جانے والے باقی تمام حیوانات سے کہیں زیادہ ہے۔ خیال ہے کہ ابھی کیڑوں مکوڑوں کی ہزاروں اقسام کا شمار نہیں ہو سکا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے زمین، نہروں، جھیلوں اور جھاڑیوں وغیرہ میں رہتے ہیں تاہم سمندر میں بہت کم کیڑے رہتے ہیں۔

کیڑے مکوڑے فطرت کا بہت اہم حصہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے زمینی حیوانات کی غذا کا دارومدار ان کیڑے مکوڑوں پر ہوتا ہے۔ بہت سی چڑیاں ایسی ہیں جو کیڑوں مکوڑوں کی تلاش میں طویل فاصلے طے کرتی ہیں۔ کیڑے مکوڑے پیڑ پودوں کو زرِ گل فراہم کرتے ہیں جس کی مدد سے پیڑ پودے بیج پیدا کر کے نئے پیڑ پودوں کی پیدائش کے لئے گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے مردہ پودوں اور حیوانات کو کھا کر ماحول کی صفائی کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے یا تو پیڑ پودوں کو کھاتے ہیں یا پھر اپنے جیسے کیڑے مکوڑوں کو۔

تاہم کچھ کیڑے مکوڑے نقصان دہ بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کچھ مختلف بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔

کیڑے مکوڑوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹے اور گول بھی ہوتے ہیں اور لمبوترے بھی۔ تتلیوں کے رنگ کیڑے مکوڑوں کی دنیا میں اور کسی دوسرے کیڑے کو میسر نہیں ہیں۔ کچھ کیڑے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو دیکھنے میں کیڑے نہیں لگتے۔ مثلاً پتوں پر چمٹے رہنے والے بہت سے کیڑے مکوڑے پتوں کی طرح لگتے ہیں اور پیڑ کی ڈالیوں سے لپٹے رہنے والے ڈالیوں کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان خصوصیات کے باعث وہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے جسم کے اعتبار سے بہت بڑے نہیں ہوتے مثلاً سب سے بڑے کیڑے کا جسم ۳۲۰ ملی میٹر طویل ہوتا ہے۔ جبکہ سب سے چھوٹا کیڑا بھنورا ہوتا ہے جو ایک فل اسٹاپ کے برابر ہوتا ہے۔

بہرحال کیڑے مکوڑوں کا جسم خواہ کوئی بھی ہو ان کا جسمانی ڈھانچہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ ایک کیڑے کا جسم تین آپس میں جڑے ہوئے حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا حصہ ان کا سر ہوتا ہے۔ جس میں آنکھیں، منہ اور ان کے مخصوص بال ہوتے ہیں اس کے بعد درمیانہ حصہ ہوتا ہے جسے (Thorax) کہتے ہیں اس حصہ میں چھ پاؤں اور پر ہوتے ہیں۔ تیسرا حصہ پیٹ اور جسم کے دیگر

چیونٹیاں دوسرے کیڑوں کو پھنسانے کے لیے سوراخ بناتی وہ ان سوراخوں میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہیں اور جیسے ہی کوئی کیڑا اس سوراخ میں گرتا ہے۔ وہ اُسے کھا جاتی ہیں۔

اعضاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ کیڑوں کے جسم میں ہم انسانوں کی طرح کا ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ان کے جسم کا بیرونی حصہ بہت سخت ہوتا ہے جس کے سہارے ان کا پورا جسم مستحکم رہتا ہے۔

اس طرح کی جسمانی ساخت کے باعث کیڑوں کو مختلف مقامات پر رہنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کیڑوں مکوڑں کے جسم چونکہ بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اس لئے ان کے پر انہیں بہ آسانی لے کر اڑ سکتے ہیں۔ دنیا میں کچھ ایسے کیڑے مکوڑے بھی پائے جاتے ہیں جو پیچھے کی جانب بھی اڑ سکتے ہیں۔ مکھیوں اور شہد کی مکھیوں کے پاؤں میں اشیاء سے

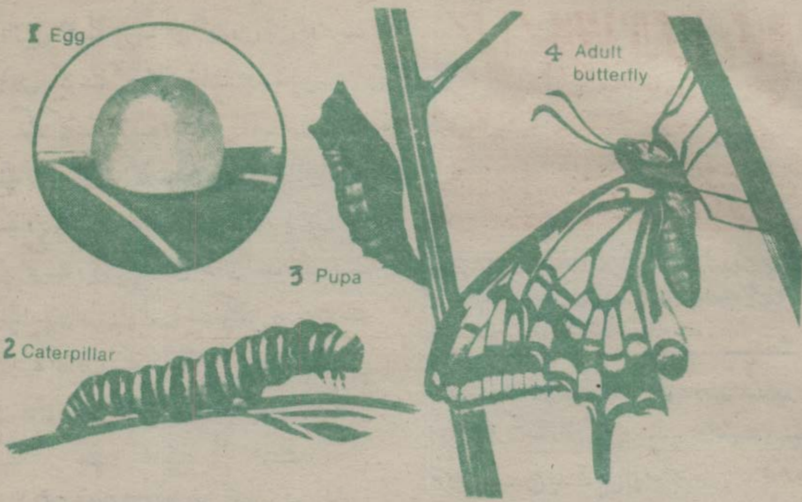

تتلی کی زندگی کے چار درجہ دار مراحل۔

چمٹنے والی گدیاں ہوتی ہیں جن کی مدد سے وہ دیواروں یا پیڑ پودوں کی شاخوں پر آسانی کے ساتھ اوپر نیچے آجا سکتی ہیں۔ کچھ کیڑے مکوڑے اپنے پیروں کو زمین کھودنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کچھ کیڑوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ اپنے منہ سے لکڑی کاٹ سکتے ہیں۔

تمام بالغ کیڑے مکوڑوں کو زندہ رہنے کے لئے ہر لمحہ تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم کچھ کیڑے مکوڑے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے جسم میں ہوا بھر کر تھوڑی دیر کے لئے پانی کے اندر رہ سکتے ہیں۔ پانی میں جاکر یہ کیڑے جمع کی ہوئی ہوا کو سانس لینے کے کام میں لاتے ہیں۔ یہ کیڑے پانی میں تیرنے کے لئے اپنے پیروں کو چپوؤں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کیڑوں مکوڑوں کو بہت سی حسوں سے نوازا ہے۔ مثال کے طور پر آنکھوں سے کیڑے مکوڑے دیکھنے کا کام لیتے ہیں جب کہ چہرے پر موجود مخصوص مونچھوں جیسے بالوں کو سونگھنے کے آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

کچھ کیڑے منہ کے ذریعے ذائقہ محسوس کرتے ہیں جب کہ کچھ پیروں کے ذریعہ۔ یہ تمام حسیں کیڑے مکوڑوں کو غذا اور ایک دوسرے کی تلاش کے علاوہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ کچھ کیڑوں کے کان ان کی ٹانگوں پر ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بہت سے کیڑے ایک مخصوص انداز میں اپنی ٹانگوں کو آپس میں رگڑتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ دراصل کچھ

آوازیں نکالتے ہیں۔ ان آوازوں میں دوسرے کیڑوں کے لئے مخصوص پیغامات ہوتے ہیں۔

کچھ کیڑے انڈے دیتے ہیں جب کہ کچھ زندہ بچے دیتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی مادائیں زمین کے اوپر یا زمین کے اندر پانی کے اندر یا پتوں کے اوپر انڈے دیتی ہیں۔ ان انڈوں سے نکلنے والے بچے اپنے والدین کی طرح کے لگتے ہیں۔ بہت سے کیڑے مکوڑوں کے بچے عجیب و غریب انداز میں بڑے ہوتے ہیں مثال کے طور پر تتلیوں اور پتنگوں کے بچے پہلے مرحلے پر (CATERPILLER) (تتلیوں اور کیڑوں کے بچوں کا ابتدائی مرحلہ) کی صورت میں انڈوں سے باہر نکلتے ہیں۔ انڈوں سے نکلتے ہی یہ اپنے اردگرد ایک جال سا بن لیتے ہیں۔ پھر اس جال میں سے بالغ بچہ ظاہر ہوتا ہے۔

پانی کی سطح پر تیرنے والا ایک کیڑا۔ یہ کیڑا اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ پانی کی سطح پر آسانی سے ساتھ چل سکتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے پاؤں پانی کے اندر نہیں جاتے

ایک کیڑے کی آنکھ۔ انسانوں کے برعکس کیڑے مکوڑوں کے چھوٹے چھوٹے بہت سارے لینس ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے کیڑوں کو اپنے دشمن کی معمولی سی حرکت نظر آجاتی ہے۔

بہت سے کیڑے مکوڑے انڈے دینے کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتے۔ جو انڈے یا بچے سردیوں سے بچ جاتے ہیں وہ موسم بہار یا موسم گرما میں بلوغت کی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

بہت سے کیڑے تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ جب کے کچھ بڑے گروہوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں بڑے بڑے گروہوں کی شکل میں بڑی بڑی کالونیاں بنا کر رہتی ہیں۔ ان کیڑوں کے بہت سے سخت قوانین ہوتے ہیں جن کی پابندی ہر گروہ کے ہر رکن پر لازم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تمام کیڑے آرام اور سکون سے رہ سکیں۔ کیڑے مکوڑوں کے قوانین بنا کر رہنے کے عمل میں ہم لوگوں کے لئے بھی ایک سبق ہے بشرطیکہ ہم اس سبق کو پڑھ، سمجھ اور یاد رکھ سکیں۔ بچوں کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے ہمیں توقع ہے کہ آپ بڑوں کے برعکس اس سبق کو پڑھیں گے، سمجھیں گے اور اس پر عمل کر کے اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دھقان

رعنا اقبال

کسی گاؤں میں شیر دل نام کا ایک کسان رہتا تھا۔ اس کے پاس بہت زیادہ زمین نہیں تھی لیکن جو بھی تھوڑی سی زمین تھی وہ اس پر بہت محنت کرتا۔ رات دن زمین کی دیکھ بھال کرتا جس کے نتیجے میں اس کی زمین سونا اگلتی اور شیر دل مسرت و سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتا۔

شیر دل جب چھوٹا ہی تھا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اس نے بڑی ذمہ داری سے اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ بچپن ہی سے زمین کی دیکھ بھال اور محنت و مشقت نے اسے وقت سے پہلے بڑا بنا دیا تھا۔

گاؤں میں شیر دل کی خاصی عزت تھی۔ بڑے اسے پیار اور شفقت سے بلاتے تو چھوٹے ہر وقت شیرو بھائی شیرو بھائی کرتے رہتے وہ سب سے خلوص سے پیش آتا۔ لیکن یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ جہاں کسی کے سو دوست ہوتے ہیں وہاں سو دشمن بھی ہوتے ہیں۔ شیر دل کے ساتھ بھی یہی ہوا اس گاؤں میں جہاں شیر دل کی زمین تھی وہیں کوڑا خان کے بھی کھیت تھے۔ کوڑا خان بالکل اپنے نام کی طرح کڑوا کسیلا آدمی تھا۔ وہ محنت کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا اسکا محبوب مشغلہ تھا۔ کمزور لوگوں پر حکومت کر کے وہ خوش ہوتا تھا۔

کوڑا خان چونکہ اپنی زمین پر بالکل محنت نہیں کرتا تھا نہ وقت پر پانی دیتا نہ کھاد ڈالتا اور فصل کو بہتر بنانے کے کسی اچھے طریقے سے تو وہ آشنا تھا ہی نہیں چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا کہ اسکی فصل خراب ہو جاتی اور اناج کم حاصل ہوتا۔ جب اسکے سوکھے کھیتوں کے برابر میں شیر دل کے کھیت لہلہاتے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا وہ اندر ہی اندر جلتا رہتا۔ آہستہ آہستہ وہ شیر دل کا دشمن ہوتا چلا گیا۔ اب وہ بجائے اپنے کھیتوں پر مزید توجہ دینے کے مستقل یہ سوچتا رہتا کہ شیر دل کو کس طرح نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ شیر دل کی فصل کس طرح خراب کی جاسکتی ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی گھر کرتا چلا گیا کہ اس کی زمین میں ہی کوئی خرابی ہے اور اسی لئے اس کی فصل شیر دل کے مقابلے میں کم ہوتی ہے ادھر شیر دل نے اپنی زمین پر مزید توجہ اور محنت صرف کرنا شروع کر دی تھی وہ کوڑا خان کی باتوں اور اس کے رویئے سے سمجھ گیا تھا کہ کوڑا خان کے دل میں کیا ہے۔ وہ اب بہت چوکنا رہنے لگا اور کبھی اپنے کھیتوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا اس لئے کوڑا خان کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی اسے کوئی موقع نہ ملا کہ وہ اپنی چال چل سکے۔

اب کوڑا خان نے اپنی فصل پوری کی پوری گھر میں ہی رکھنا شروع کر دی۔ ذخیرہ اندوزی کر کے وہ برے وقت میں غریب لوگوں سے پیسہ وصول کرتا تھا اور گاؤں کے غریب لوگ بھوکا مرنے سے بہتر اس بات کو سمجھتے تھے کہ مہنگے داموں ملاوٹ شدہ اناج خرید لیں۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پورے سال گاؤں میں بارش کا ایک قطرہ نہ ٹپکا سب فصلیں سوکھ گئیں کسان بیچارے پانی کہاں سے لاتے۔ گاؤں میں فاقے کی نوبت آگئی۔ اناج کا قحط پڑنے کی وجہ سے ذخیرہ اندوزوں کی بن آئی۔ انہی میں کوڑا خان بھی شامل تھا۔ بیچارا شیر دل اپنے بھوکے بہن بھائیوں کی اتری ہوئی صورتیں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے وہ سیدھا کوڑا خان کے پاس گیا اور بڑی منت سے بولا۔ ”بھائی کوڑا خان! گاؤں کے حالات تم دیکھ رہے ہو۔ میرے گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں ہے۔ تم مجھے کچھ اناج دے دو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی میری فصل بہتر ہو گی میں تمہارا ایک ایک دانہ چکا دوں گا۔ میں اپنے ننھے ننھے بہن بھائیوں کو بھوکا نہیں سلا سکتا۔“

کوڑا خان نے دل میں سوچا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب شیر دل کو پھانسا جا سکتا ہے۔ اس نے بڑی مکاری سے شیر دل سے کہا۔

"بھائی تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں اور تم الگ تو نہیں ہیں۔ تمہارے بہن بھائی میرے بھی بہن بھائی ہیں۔ جتنا اناج چاہو لے جاؤ اور انہیں کھلاؤ جب ضرورت پڑے اور لے جانا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس میری ایک شرط ہے۔"

شیر دل تو پہلے ہی کوڑا خان کو سمجھتا تھا وہ اس بات سے اور چوکنا ہو گیا لیکن گھبرایا نہیں خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"ارے کوڑا خان! جب بھائی کہہ ہی دیا تو پھر شرط کیسی۔ بھائیوں میں بھی کبھی شرطیں طے ہوتی ہیں۔ تم اطمینان سے بولو کیا بات ہے؟"

کوڑا خان بولا۔

"دیکھو ایک تو میرے پاس زمین ویسے ہی کم ہے پھر فصل بھی اچھی نہیں ہوئی تم ایسا کرو اپنی زمین بھی مجھے دے دو۔ گھر میں جتنے اناج کی ضرورت ہوا کرے لے جایا کرنا۔ دراصل تمہارے کھیت کی مٹی بہت اچھی ہے نا اس لئے تمہاری فصل بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ شیر دل پہلے ہی ایسی باتوں کے لئے تیار تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا "کوڑا خان یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ میرے کھیت تمہارے کھیت۔ میرے پاس رہیں یا تمہارے پاس بات تو ایک ہی ہے لیکن تم یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہو تمہارا کہنا یہ ہے کہ میرے کھیت کی مٹی بہت اچھی اور زرخیز ہے اس لئے فصل عمدہ ہوتی ہے جبکہ تمہارے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے......

"ہاں یہ تو ہے۔" کوڑا خان درمیان میں ہی بول پڑا۔

"تو ٹھیک ہے۔ کوڑا خان تم آج ہی میرے کھیت کی تمام مٹی کھود کر اپنے کھیت میں ڈال لو...... اور اب جلدی سے مجھ کچھ اناج دے دو تاکہ ماں کچھ پکا سکے بچے بہت بھوکے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اناج لے کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

کوڑا خان نے اسی وقت سے شیر دل کے کھیت کی مٹی کھود کھود کر اپنے کھیت میں ڈالنی شروع کر دی۔

تھوڑے عرصے کے بعد خدا کا فضل ہوا شیر دل کی محنت اور توجہ رنگ لائی بارش بھی خوب جم کر ہوئی اور شیر دل کی زمین سے جو سونا نکلا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کے کھیت جب ہوا سے لہلہاتے تو شیر دل کا دل بھی جھومنے لگتا۔ دوسری طرف کوڑا خان شیر دل کے کھیت کی مٹی اپنے کھیت میں ڈالنے کے بعد تو

بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ کر اطمینان سے بیٹھ گیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ بس اب شیر دل کے کھیت کی مٹی سے وہ بھی بہترین فصل حاصل کر لے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا...... شیر دل کی فصل کٹ کر جب گھر آئی تو شیر دل وہ تمام اناج جو کوڑا خان سے لایا تھا واپس کرنے اس کے گھر گیا۔

"لو کوڑا خان۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اس وقت میری مدد کی۔ اب میں یہ اناج واپس کرنے آیا ہوں خدا کا شکر ہے کہ اس بار فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔"

کوڑا خان اندر سے تو جل بھن گیا تھا لیکن پھر شیر دل سے بولا۔ "ایک بات بتاؤ شیر دل۔ تم نے اپنے کھیت کی مٹی مجھے دے دی اس کے باوجود تمہارے یہاں اچھی فصل ہوئی لیکن تمہاری مٹی میری فصل پر کوئی اچھا اثر نہ ڈال سکی آخر اس میں کیا راز ہے۔"

شیر دل ہنسا۔ پھر بولا۔

"بھائی صرف مٹی ہی فصل کو اچھا یا برا نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنے کھیت کی مٹی تمہیں دے دی لیکن میرے یہاں فصل پھر بھی اچھی ہوئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے پہلے سے زیادہ محنت کی۔

پہلے سے زیادہ توجہ دی۔

دن رات کی کوشش اور لگن سے مجھے خدا نے یہ پھل دیا۔ پھر میں نے محنت کرنے کے ساتھ ساتھ دن رات خدا سے بھی دعا مانگی کہ میری فصل اچھی ہو جائے اور میں تمہارا قرضہ اتار سکوں۔

تو میرے دوست اچھی فصل کے لئے مٹی، کھاد اور پانی کے علاوہ محنت و لگن کی بھی بہت ضرورت ہوتی ہے، سمجھے۔

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا اور کوڑا خان کڑوا سا منہ بنا کر اسے تکتا رہ گیا۔

ٹانگوں کی ضرورت ہے

انگلینڈ میں ایک ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ جس پر موٹے موٹے الفاظ میں لکھا ہے "ٹانگوں کی ضرورت ہے" جب لوگ پہلی بار اس بورڈ کو دیکھتے ہیں تو وہ اس طرف کھینچے چلے آتے ہیں لیکن جب بورڈ کے قریب پہنچتے ہیں تو ان موٹے الفاظ کے نیچے باریک الفاظ لکھے دکھائی دیتے ہیں "ہماری سلی ہوئی پتلونوں میں ڈالنے کے لئے۔"

(سکھر سے ایم۔ خرم معراج کا شگوفہ)

زبان

مولوی احمد علی

ہے زباں محض گفتگو کے لئے ۔۔۔ اور اظہار آرزو کے لئے
جو برا بول بچّہ بولتا ہے ۔۔۔ اور پھکّڑ زباں سے تولتا ہے
نہ کوئی اس سے پیار کرتا ہے ۔۔۔ نہ کوئی اس کے مرنے مرتا ہے
نہ ہو اس پر نگہ محبت کی ۔۔۔ نہ نظر اس پہ ہوگی شفقت کی
بچّے جو نیک باتیں کرتے ہیں ۔۔۔ اور اچھی طرح سے پڑھتے ہیں
کام لیتے ہیں وہ زباں سے نیک ۔۔۔ پھل وہ پا لیتے ہیں جہاں سے نیک
بچّے جو باتمیز ہوتے ہیں ۔۔۔ ہر طرح سے عزیز ہوتے ہیں
دن بدن ان کی عزّت ہوتی ہے ۔۔۔ اور ترقّی پہ دولت ہوتی ہے
بچو تم نیک ذکر کرتے رہو ۔۔۔ اپنی روٹی کا فکر کرتے رہو

میری پہلی تحریر

آپ کچھ لکھنا چاہتے ہیں
آپ کی خواہش ہے کہ آپ کی کوئی تحریر شائع ہو
آپ مستقبل کے بڑے ادیب بننا چاہتے ہیں

تو پھر دیر کس بات کی

اپنی پہلی تحریر آج ہی ہمیں بھجوا دیجئے۔
آنکھ مچولی کے صفحات آپ کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے حاضر ہیں۔

خیال رہے

* "میری پہلی تحریر" کے مستقل سلسلے میں صرف وہی قلمکار شریک ہو سکتے ہیں جن کی کوئی تحریر آج تک شائع نہ ہوئی ہو۔ (آنکھ مچولی یا کسی اور رسالے میں)
* پہلی تحریر شائع ہو جانے کے بعد دوسری تحریر اس عنوان کے تحت شائع نہ ہو سکے گی۔
* تحریر مختصر، صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک جانب لکھی گئی ہو۔ اپنی نگارش کے اختتام پر نام پتہ ضرور لکھیں۔
* لکھنے کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں، بس اختصار اور دلچسپی شرط ہے۔
* تحریر بھجوانے سے قبل کسی بڑے استاد یا بڑے لکھنے والے سے اصلاح لے لینا بہتر ہوگا
* "میری پہلی تحریر" کا دلچسپ سلسلہ اکتوبر ۹۰ء سے شروع ہو رہا ہے۔ پہلی فرصت میں اپنی تحریر بھجوا دیجئے۔

"میری پہلی تحریر" ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۱، ڈی ۱ سائٹ کراچی

جم ہینسن

آمنہ ابراہیم

یہ مضمون محترمہ آمنہ ابراہیم نے ہمیں امریکہ سے ارسال کیا۔

پیارے ساتھیو ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ سیسم اسٹریٹ پپٹ شو کے بانی جیم ہینسن پچھلے مہینوں چل بسے۔ مرنجان مرنج شخصیت کے مالک جیم ہینسن میسی سپی میں پیدا ہوئے۔ موت کے وقت ان کی عمر صرف ۵۳ سال تھی۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔ نمونیہ ان کی موت کا بہانا بنا۔

دس سال قبل جب میں امریکہ آئی تھی میں نے یہاں کے پبلک ٹی وی چینل ۹ پر جب سیسم اسٹریٹ دیکھا تب بچو ! تم سب مجھے بہت یاد آئے۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ اللہ کرے ہمارا ٹی وی بھی اس مفید پروگرام کو منگائے۔ اللہ نے میری

جیم ہینسن سابقہ امریکی صدر کے ہمراہ۔

دعا غالباً سن لی جب پچھلے دنوں میں پاکستان گئی تو اپنے نواسوں اور نواسی کو جمعہ کی صبح اس پروگرام کا انتظار کرتے پایا۔ یہ جان کر کہ اب پاکستان میں بھی جمعہ کو سیسم اسٹریٹ دکھایا جاتا ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہاں امریکہ میں بچے روزانہ سیسم اسٹریٹ دیکھتے ہیں۔ میرے شہر سیاٹل میں دن میں دو بار یہ پروگرام دکھایا جاتا ہے۔ آپ کے اور ساری دنیا کے بچوں کی طرح یہ امریکہ کے بچوں کا بھی پسندیدہ پروگرام ہے۔

جیم ہینسن نے پپٹ بنانے کا آغاز ۱۹۵۵ء میں کیا جب وہ یونیورسٹی آف میری لینڈ میں طالب علم تھے۔ ان کی شریک کار ان کی ہونے والی بیوی جین بھی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے واشنگٹن ڈی سی میں اپنے پہلے شو کا آغاز پبلک ٹی وی پر ۱۹۶۹ء میں کیا۔ اس پروگرام کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں یہ بچوں کو مختلف قسم کی تفریح مہیا کرتا ہے وہاں بچے اپنے ابتدائی تعلیم کے لئے تیار بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ میں اتنے برس اس پروگرام کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انگریزی کے ہجے کرنے کا یہ طریقہ ان بڑوں کے لئے بھی مفید ہے جو انگریزی سیکھ رہے ہوں۔ ان بیس اکیس برسوں میں جہاں "ہینسن" نے لاکھوں ڈالر کمائے وہاں ساری دنیا میں اپنے اس عظیم کارنامے پر شہرت بھی حاصل کی۔

ہینسن نے اپنی ساتھی (FRANK 0Z) کے ساتھ مل کر یہ کارہائے نمایاں انجام دیا۔ ہینسن کی رفیق حیات جین ان کے بچے ساتھی دوست اور ساری دنیا کے بچے جنہوں نے یہ پروگرام دیکھا ہے ان کی موت کی خبر سن کر اداس ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ جو لوگ دنیا میں دوسروں کی

جیم ہینسن اپنے اہل خانہ کے ہمراہ۔

بھلائی کے لئے کام کرتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔

اس کے بنائے ہوئے PUPPETS کی تعداد تقریباً چار سو ہے۔ میں چند PUPPETS کے نام لکھنا چاہتی ہوں تاکہ آپ ان کے صحیح تلفظ سے واقف ہوں۔

Termit the frog
Burt, Ernie
Cookie monster
Miss Piggy
Oscar the growch

Fraggle Rock
Gonzo, Eagle,
Dr. Terth animal
Rowlf The Cool
Capt.Link
Honey Dew
Hearllhrof

جیم ہینسن کا کہنا تھا کہ میری خواہش ہے کہ میں اس دنیا کو اس سے زیادہ بہتر حالت میں چھوڑوں جیسا کہ میں نے اسے پایا تھا۔ اب یہ فیصلہ تو تم لوگوں کو کرنا ہے کہ ہینسن کی یہ خواہش کس حد تک پوری ہوئی۔

جیم ہینسن کے تخلیق کردہ مپٹ پر مبنی ٹی وی فلم کے تین مناظر۔

اُلٹنے کہ کار بیٹھ گئی ہے زمین پر ←

← میں جیسا ہوں نظر آتا نہیں ہوں۔

مپٹ بیٹھے ہیں گاڑی میں
ہے گاڑی اپنے کاندھوں پر

ببلی، املی اور چغلی

محمد عمر احمد خان

ببلی کو چغلی اور مجھے املی کھانے کا شوق کس طرح ہوا یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے بچپن میں جانا پڑے گا جب میں چھوٹا سا لڑکا ہوا کرتا تھا اور ببلی بھی چھوٹی سی بچی تھی۔

اس دور میں ببلی اسکول سے واپس آنے کے بعد سارا دن گڑیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی جب کہ مجھے شرارتوں اور کھیلنے کودنے سے ہی فرصت نہ ملتی اٹھا پٹخ اور دھینگا مشتی میں مجھے ماہر اعظم تسلیم کیا جاتا۔میری شرارتوں کا نشانہ بننے والے میری حرکتوں اور شرارتوں سے پناہ مانگتے تھے۔

بچپن کا دور حسین یادوں کا ہوتا ہے ایسی یادیں جو ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو یادوں کے انمول رنگ دھنک کے رنگ برنگے رنگوں کی طرح میرے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگتے ہیں اور آنکھیں ایک ایک کر کے گذرا ہوا زمانہ، گزرے ہوئے لمحات اور گزرے ہوئے حسین ماضی کو یاد دلاتی ہیں۔

بچپن یاد کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرا بچپن لوٹ آیا ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو...... لگتا ہے کہ میں بچہ بن گیا ہوں۔ ساتھیوں ہمجولیوں کے ساتھ لنگڑی پالا، آنکھ مچولی، چور سپاہی، پکڑم پکڑائی، سرپالا کھیل رہا ہوں۔ کبھی میں اپنے آپ کو پتنگ اڑاتے دیکھتا ہوں تو کبھی لٹو چلاتے۔ کبھی باغ میں درختوں پر چڑھا پھل توڑ رہا ہوتا ہوں تو کبھی شرارتیں کر رہا ہوتا ہوں۔ آنکھیں بند کر کے چور سپاہی والے کھیل کا تصور کرتا ہوں تو سارا منظر میری نگاہوں کے سامنے کھنچ آتا ہے۔ میں خود کو بہت سارے بچوں کے حلقے میں کھڑا پاتا ہوں جو مجھے ایک گول دائرے میں گھیرے کھڑے ہوتے ہیں۔

مجھے دکھائی دیتا ہے کہ میں بچوں کے بیچ حلقے میں کھڑا زور زور سے کہہ رہا ہوں!

"ادھر کا تالہ توڑیں گے ادھر کا تالہ توڑیں گے"

اور بچے میری صدا پر "سپاہی کو بلائیں گے" کا واشگاف نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ کبھی مجھے لال پری والا کھیل یاد آنے لگتا ہے جب کوئی ساتھی میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا!

"لال پری آنا، چپکے چپکے آنا ٹپہ مار کے جانا، ہنسنا نہ مسکرانا"

میری آنکھیں بند ہوتیں۔ لڑکوں میں سے کوئی اٹھ کر آتا اور آہستہ سے میرے سر پر چپت رسید کر کے اپنی جگہ واپس چلا جاتا۔ آنکھ کھلنے پر میرا یہ کام ہوتا کہ مجھے چپت رسید کرنے والے لڑکے کا نام بتانا پڑتا یا دوسرے الفاظ میں لال پری کا نام بتانا ہوتا۔ اس کھیل میں کتنی پریاں ہوتی۔ کوئی لال پری، کوئی نیلی پری کوئی پیلی پری تو کوئی کالی پری۔ مگر یہ سب پریاں نہ تھیں بلکہ یہ لڑکوں کے کوڈ ورڈز تھے۔ اس کھیل میں چپت لگانے والا لڑکا اپنی ٹولی میں جا کر بیٹھ جاتا اور پھر یہ پتہ چلانے کے لئے کہ چپت کس نے لگائی ہے چپت کھانے والا سب کے کان چھو کر دیکھتا جس کا کان گرم ہوتا وہی چور ہوتا۔

مجھے ببلی کی سہیلیوں کے گیتوں والے کھیل ابھی تک یاد ہیں۔ ان کھیلوں کا تصور کرتا ہوں تو ببلی اور اس کی سہیلیاں اچھلتی کودتی ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارتی اور یہ گیت گاتی دکھائی دیتی ہیں!

مرزا صاحب کی بیٹی
طوطا ہاتھ میں لیتی
طوطا باغ میں جاتا
سو سو چھڑیاں کھاتا

آج جب میں اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بچے بہت سارے کھیل کھیلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں مجھے پرانے کھیل نظر نہیں آتے۔

ببلی میرے ساتھ نہیں کھیلتی تھی کیونکہ میں لڑائی کے دوران اس کی گڑیوں کے ہاتھ پیر توڑ دیتا یا پھر سیاہی سے گڑیوں کے چہروں پر مونچھیں بنا دیتا جس کی وجہ سے وہ گڈے لگنے لگتیں۔ ببلی میری حرکتوں سے

پناہ مانگتی۔ شاید اس کی بے زبان گڑیاں بھی مجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔

جب میں ببلی کی کسی گڑیا کے ہاتھ پیر توڑ دیتا یا کسی گڑیا کا منہ کالا کر دیتا تو ببلی خوب روتی چلاتی۔ اس کی پکار سن کر امی آجاتیں پھر وہ سارا مقدمہ سنتیں اور پھر جرم ثابت ہو جانے پر وہ میرے لئے مختلف سزائیں تجویز کرتیں کبھی میرے کان کھینچے جاتے اور کبھی مجھے مرغا بنایا جاتا۔ بالکل اس طرح جیسے ماسٹر صاحب کلاس میں لڑکوں کو انسان بنانے کے بجائے مرغا بنا دیتے تھے۔

میں دونوں سزاؤں سے ڈرتا تھا۔ کان کھینچے جانے والی سزا سے اس لئے ڈرتا تھا کہ دادی اماں کہتی تھیں جن بچوں کے کان بچپن میں کھینچے جائیں تو بڑے ہونے پر ان کے کان گدھے کے کانوں جتنے لمبے ہو جاتے ہیں۔

امی جب میرے کان زور زور سے کھینچ لیتیں تو میں بھاگا بھاگا آئینے کے پاس جاتا اور آئینے میں اپنے کانوں کا بغور جائزہ لیتا کہ کان کہیں گدھے کے کانوں جتنے لمبے تو نہیں ہو گئے۔

کان دیکھنے میں ہمیشہ چھوٹے ہی نظر آتے لیکن میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھتے۔ میں خواب میں دیکھتا کہ میرے کان لمبے ہو گئے ہیں اور ہوا میں ہل رہے ہیں پھر میری آنکھ کھل جاتی گھبرا کر میں فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا کان چھوٹے ہی محسوس ہوتے لیکن میرا دل مطمئن نہ ہوتا میں بستر سے نیچے اترتا اور بڑی الماری کے سامنے لائٹ جلا کر کھڑا ہو جاتا۔ آئینے میں کان چھوٹے ہی نظر آتے تو میں مطمئن ہو جاتا لیکن مجھے ہر آن اپنے کانوں کے لمبے ہو جانے کا ڈر لگا رہتا۔ اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے میں خود ہی اپنے آپ سے کہتا!

"بھلا انسانوں کے کان بھی کہیں لمبے ہوئے ہیں۔"

اچانک مجھے اپنے ایک پھوپھا کا خیال آجاتا جن کے کان قدرتی لمبے تھے پھوپھا کے کانوں کا خیال آتے ہی میرے دل میں پھر وسوسے آنے لگتے میری کلاس میں ایک لڑکا پڑھتا تھا۔ ساجد...... اس کے کان کچھ لمبے تھے بالکل اسٹار ٹریک والے کن کھڑے اور میرے پھوپھا کے کانوں کی طرح میں اس سے پوچھتا کہ کیا وہ گھر میں شرارتیں کرتا ہے اور کیا اس کی امی اس کے کان کھینچتی ہیں؟ میرے ان سوالوں پر وہ جھینپ جاتا اور کہتا!

"نہیں میں شرارتیں نہیں کرتا اور نہ ہی میری امی میرے کان کھینچتی ہیں"۔

میں حیران ہو کر اس کے کانوں کی طرف دیکھتا پھر اس سے پوچھتا!

"پھر یہ تمہارے کان گدھے کے کانوں کے جتنے لمبے کیوں ہیں۔؟"

میری یہ بات سن کر وہ خفا ہو جاتا۔ مجھے مارنے دوڑ پڑتا اور مجھے بھاگ کر اپنی جان بچانا پڑتی کیونکہ وہ کن کھڑے کی طرح صحت مند اور لمبا بھی تھا۔ اگر وہ مجھے پکڑ لیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ میرے کان پکڑ کر

کھینچتا اور انھیں اپنے کانوں کے برابر لمبا کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسا ہو جاتا تو پھر کلاس میں دو کن کھڑے ہو جاتے ایک وہ اور ایک میں۔

اب میں امی جان کی اس دوسری سزا کا ذکر کروں گا جو کان کھچائی کے بعد وہ تجویز کرتی تھیں اور وہ سزا تھی مجھے مرغا بنانا۔ آپ لوگ سوچیں گے کہ بھلا یہ تو کوئی خوفناک سزا نہ ہوئی۔ بے شک یہ سزا اتنی خوفناک نہ تھی جتنا امی جان اسے میرے لئے خوفناک بنا دیا کرتی تھیں۔

اگر امی جان مجھے صرف سادہ قسم کا مرغا بننے کو کہتیں تو میں ساری عمر بننے کے لئے تیار رہتا۔ مرغا بننے سے مجھے اس لئے ڈر لگتا کہ امی مجھے مرغا بنا کر ایک بھاری بھرکم مرغے کو میری پیٹھ پر بٹھا دیتیں اور وہ بھاری مرغا تھا۔ ببلو

جی ہاں ببلو۔ ببلو میرا چھوٹا بھائی تھا لیکن وہ اتنا موٹا اور غبارے کی طرح **پھولا** ہوا تھا کہ مجھ سے اور بلی سے بھی بڑا دکھائی دیتا۔ بلی اور میرے دبلے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ببلو اکثر ہمارے حصے کی خوراک بھی کھا جاتا تھا۔

ببلو اور مجھ میں فرق یہ تھا کہ میں گھر میں مرغا بنتا تھا جبکہ ببلو اسکول میں مرغا بنتا تھا۔

ببلو کو ہر وقت بکری کی طرح جگالی کرنے کی عادت تھی۔ وہ کسی بھوکی مرغی کی طرح ہر وقت چگتا رہتا تھا۔ اگر اسے کھانے کی کوئی چیز نہ ملتی تو وہ کاغذ، کوئلہ، پنسل کے اندر کا مصالحہ اور ربڑ وغیرہ تک کھا جاتا۔ اس کے بستے کی تمام چیزیں اس کی بسیار خوری کا نشانہ بن چکی تھیں صرف بستہ ہی باقی رہ گیا تھا جو کہ چمڑے کا تھا اور اس سے چبایا نہ جاتا تھا کلاس میں وہ ماسٹر صاحب کی لائی ہوئی چاکیں تک کھا جاتا تھا لیکن جو چیز اسے سب سے زیادہ پسند تھی وہ مٹی تھی وہ بڑے شوق سے مٹی کھاتا تھا۔

مٹی کھانے پر وہ تقریباً روز ہی امی جان سے پٹتا تھا لیکن اس کی یہ عادت نہیں چھٹتی تھی۔ دادی جان اسے ڈراتیں کہ مٹی کھانے والوں کے پیٹ میں لمبے لمبے کیڑے ہو جاتے ہیں لیکن وہ ببلو تھا ڈراؤنی باتیں اس پر اثر ہی نہ کرتیں اس کا بس چلتا تو وہ لمبے لمبے کیڑوں کو بھی چٹ کر جاتا۔

بھاری بھرکم ببلو کو جب میری پیٹھ پر بٹھایا جاتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد دی گئی ہو کچھ دیر تک تو میں مرغ کی طرح اکڑوں کھڑا رہتا لیکن جب ہمت جواب دے جاتی تو میں رکوع سے سجدے میں چلا جاتا۔ میرے سجدے میں جانے سے ببلو نیچے گر جاتا جب ایسا ہوتا تو پھر دوبارہ مجھے مرغا بنایا جاتا اور پھر ببلو کو میری پیٹھ پر بیٹھنے کا چانس ملتا۔

ببلو کو میری پیٹھ پر بیٹھنے میں بڑا مزا آتا وہ میری پیٹھ پر بیٹھ کر خوب خوش ہوتا خوشی کے مارے ہاتھ ہلاتا، قہقہے لگاتا اور بے پناہ خوشی کا اظہار کرتا لیکن اس کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی کیونکہ جیسے ہی میں سجدے میں جاتا ببلو زمیں بوس ہو جاتا اور نیچے گرنے سے اس کی ساری خوشی خاک میں مل جاتی۔

خیر چھوڑیئے اس بات کو بھی۔ آیئے! اب اس قصے کی طرف چلتے ہیں جو کہ اس کہانی کا عنوان ہے یعنی ببلی، املی اور چغلی۔

اس قصے میں آپ کو پتہ چلے گا کہ کس طرح ببلی کو چغلی اور مجھے املی کھانے کا شوق ہوا۔

اس وقت جبکہ میں ابتدائی جماعت میں تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ املی کس چیز کا نام ہے لیکن جب میں چوتھی جماعت میں گیا تو مجھے املی جیسی کھٹی اور چٹخارے دار چیز کا پتہ چلا وہ بھی اس طرح کہ ایک روز ہاف ٹائم میں میرے چند ہم جماعت بھورے سے رنگ کی کوئی چیز لے آئے اور بڑے مزے لے لے کر اسے کھانے لگے۔

میں نے جب انھیں چٹخارے لے لے کر کوئی چیز کھاتے دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ حیران ہو کر بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چیز کھا رہے ہیں۔

میرے اس سوال پر لڑکوں نے بھورے رنگ کی وہ چیز چھپالی ایک لڑکے نے کہا!

"خبردار! اسے نہ بتانا یہ ماسٹر صاحب کو بتا دے گا۔"

"نہیں بتاؤں گا میں!" میں نے لڑکوں کو یقین دلانا چاہا پہلے تو لڑکے راضی نہ ہوئے لیکن جب میں نے انہیں دھمکی دی کہ اب میں ضرور ماسٹر صاحب کو بتاؤں گا کہ تم لوگ بھورے رنگ کی کوئی چیز چھپ کر کھا رہے ہو تو لڑکے راضی ہو گئے۔

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ لڑکوں نے مارے ڈر کے فوراً بھورے رنگ کی کوئی چپٹی سی چیز میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ کیا چیز ہے؟!!!" بڑے حیران ہو کر میں نے پوچھا۔

"کھا کر دیکھو تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔" لڑکے بولے۔ میں نے تھوڑی سی وہ چیز منہ میں ڈالی۔ "ارے یہ تو کھٹی ہے۔" میں نے منہ بنایا۔"

"مزیدار بھی تو ہے!" لڑکے بولے۔ میں نہیں کھاتا۔" میں نے لڑکوں کو وہ بھوری چیز واپس کرنا چاہی۔ لڑکے بولے۔ "تھوڑی سی اور کھاؤ مزا آئے گا۔"

میں نے تھوڑی سی اور کھائی۔ پہلے تو منہ کھٹا ہوا لیکن پھر مزا آنے لگا اور میں چٹخارے بھرنے لگا۔

"کیوں مزا آیا؟"

"ہاں واقعی بڑی مزیدار چیز ہے!"

"ماسٹر صاحب کو تو نہیں بتاؤ گے نا؟"

"نہیں بتاؤں گا۔"

"لو اور لو۔"

"اس چیز کا نام کیا ہے؟"

میرے اس سوال پر تمام لڑکے حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر ان میں سے ایک لڑکے نے حیرانی سے پوچھا:

"کیا واقعی تمہیں اس چیز کا نام نہیں معلوم؟"

"نہیں!" بدھو کی طرح میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"حیرت ہے! تمہیں اس چیز کا نام نہیں معلوم ورنہ تو ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں میں نے پوچھا۔

"املی کہتے ہیں اسے۔ املی نام ہے اس کا۔" لڑکوں نے بتایا۔

وہ املی جو میں نے زندگی میں پہلی بار کھائی میری معصوم زندگی کا سب سے حیرت انگیز اور انوکھا تجربہ ثابت ہوئی۔ میں حیرت سے دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ میں کتنا احمق ہوں کہ اتنی چٹ پٹی اور مزیدار چیز سے لاعلم رہا لیکن اب میں احمق نہیں رہا تھا کیونکہ مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ املی کتنی مزیدار چیز ہے۔

دوسرے دن میں نے وہ دکان بھی دریافت کر لی جہاں سے لڑکے املی خرید کر لایا کرتے تھے یہ دکان اسکول کی بالکل نکڑ پر تھی اور لکڑی کے ایک چھوٹے سے کھوکھے پر مشتمل تھی اس دکان کے مالک ایک بڑے میاں تھے نام تو ان کا پتہ نہیں کیا تھا لیکن اسکول کے سب بچے باباجی کہا کرتے تھے۔ باباجی بڑے اچھے انسان تھے بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ سستے داموں ربڑ پنسل، قلم، دوات، کاپی، کتابیں وغیرہ فروخت کرتے۔ ان کی دکان پر بچوں کا رش لگا رہتا۔

میں باباجی کی دکان سے ربر، پنسل یا قلم وغیرہ تو نہیں خریدتا ہاں البتہ املی ضرور خریدتا۔

کلاس میں جتنے لڑکے املی کھاتے تھے اب ان میں سب سے زیادہ املی کھانے والا لڑکا میں تھا زیادہ املی کھانے سے میرے دانت کھٹے ہو جاتے لڑکے مجھے ڈراتے کہ زیادہ املی کھانے سے تمہارے گلے دکھنے آجائیں گے ڈاکٹر تمہارا گلا کاٹ دے گا لیکن میں باز نہ آیا۔ املی تھی ہی ایسی چیز کسے چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا شاید بچپن میں ببو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ مٹی کھانے کی وجہ سے اس کا دل بھی مٹی کھانے کو چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

گھر میں بہت دنوں تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ میں املی کھاتا ہوں گھر والوں کو پتہ بھی کیسے چلتا کیونکہ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے املی کھاتا تھا لیکن ایک دن میرے کمرے میں املی کے دانے دیکھ کر ببلی کو شک ہو گیا اور اس نے مجھے سے پوچھ ہی لیا!

"بھیا! تم املی کھاتے ہو؟"

ببلی کا یہ سوال سن کر میں خوفزدہ ہو گیا سہم کر بولا،

"امی کو نہ بتانا!" یہ سب بالکل اسی طرح ہوا جیسا کہ کلاس میں پیش آیا تھا اور لڑکے میرے پوچھنے پر سہم کر بولے تھے کہ ماسٹر صاحب کو نہ بتانا۔

مجھے ڈر تھا کہ ببلی کہیں امی جان کو نہ بتا دے کہ بھیا املی کھا رہا ہے لیکن ببلی نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ امی جان کو نہیں بتائے گی۔

مگر شام تک میرا بھانڈا پھوٹ چکا تھا ببلی امی سے میری چغلی لگا چکی تھی۔

املی کھانے پر امی نے میرا جیب خرچ بالکل بند کر دیا لیکن میں اسکول میں دوستوں کے ساتھ املی کھاتا رہا اور دوست مجھے خوب املی کھلاتے رہے اسکول میں جو املی مجھ سے کھائی نہیں جاتی وہ میں گھر آ کر کھاتا اور خوب کھاتا۔

مجھے املی کھانے کی لت پڑ چکی تھی بالکل اس طرح جیسے ببلو کو مٹی کھانے کی چاٹ لگ گئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میں نے املی کو نہیں بلکہ خود املی نے مجھے کھایا ہو۔

میرا املی کھانے کا شوق بڑھتا جا رہا تھا جبکہ ببلی کی چغلیاں لگانے کی عادت پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ امی میرے املی اور ببلی کے چغلی کھانے کی عادت سے تنگ آ چکی تھیں۔

شاید میرا املی کھانا اور ببلی کے چغلی لگانے کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ ہم دونوں کو اپنے اس شوق کو خیرباد کہنا پڑا۔

زیادہ املی کھانے سے میرے گلے دکھنے آ گئے اور میرا گلا سوج کر ببلو کی طرح ہو گیا امی پریشان ہو گئیں انہوں نے فوراً مجھے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے گلے کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ گلے کے ٹانسلز (غدود) بڑھ گئے ہیں اور انھیں بغیر آپریشن کے ٹھیک کرنا ممکن نہیں۔ امی کمزور دل کی خاتون تھیں۔ انھوں نے جب ڈاکٹر کی بات سنی تو وہ رونے لگیں اور کہنے لگیں!۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا میرا بچہ بغیر آپریشن کے ٹھیک نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں محترمہ! بغیر آپریشن کے آپ کا بچہ کسی طور پر ٹھیک نہیں ہو سکتا اور آپ نے چند دن میں اس کا آپریشن نہ کرایا تو اس کا گلا بند ہو سکتا ہے جس سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ امی کانپنے لگیں۔ میں امی سے لپٹ گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا!۔

"امی امی! میں اپنا گلا نہیں کٹواؤں گا میں یہ آپریشن ہرگز نہیں کراؤں گا۔" میں زور زور سے رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر ببلی بھی رونے لگی اور ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر بولی!

"ڈاکٹر صاحب! میرے بھیا کو بغیر آپریشن کے ٹھیک کر دیں میں اب کبھی ان کی چغلی نہیں لگاؤں گی۔"

ببلو بھی رو رہا تھا روتے ہوئے وہ ڈاکٹر سے بولا!

"ڈاکٹر صاحب! میرے بھائی جان کو بچا لیجئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ میں کبھی مٹی نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی بھائی جان کی پیٹھ پر بیٹھوں گا!"

"کیا؟ تم اپنے بھائی جان کی پیٹھ پر بیٹھتے ہو؟"

ڈاکٹر صاحب حیرت سے بولے۔

ببلی نے ببلو کو کہنی مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا ورنہ وہ مزید پول کھولتا۔

امی جان میرے گلے کے آپریشن کا سن کر رونے لگیں تھیں ڈاکٹر صاحب نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا!

"خاتون گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سا آپریشن ہو گا آپ کے بچے کو ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو گی اور چند دن میں آپ کا بچہ صحت یاب ہو جائے گا۔

قصہ مختصر یہ کہ مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا حالانکہ میں بہت رویا چلایا لیکن اب رونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

ایک دو روز بعد میرے گلے کا آپریشن کر دیا گیا ڈاکٹروں نے مجھے بے ہوش کر کے میرا آپریشن کیا تھا۔ مجھ تکلیف کا کچھ پتہ نہ چلا لیکن ہوش میں آنے کے بعد میں کافی دیر تک دہشت زدہ رہا، کیونکہ گلے میں ہلکی ہلکی تکلیف ہو رہی تھی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے مختلف دوائیں دیں جن کے استعمال سے چند دن میں ہی میرے گلے کی تکلیف دور ہو گئی۔

میں جتنے دن ہسپتال میں داخل رہا رشتے دار میری عیادت کو آتے رہے ببلی اور ببلو تو ہر وقت میرے پاس ہی موجود رہتے۔ ببلی چمچے سے مجھے دوائیں پلاتی اور ببلو بھاگ بھاگ کر میرے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا۔ دادی جان بھی روز شام کو ہسپتال آتیں وہ میرے لئے ہمیشہ تازہ پھل لاتیں۔ انھیں امی سے زیادہ میری فکر تھی وہ ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے میری صحت یابی کی دعائیں مانگتیں۔

اس واقعے کا مجھ پر اور ببلی پر گہرا اثر ہوا میں نے املی کھانے سے اور ببلی نے چغلی کھانے سے توبہ کر لی ہماری توبہ کا اثر ببلو پر بھی ہوا۔ اس نے الم غلم چیزوں اور مٹی سے نہ صرف پرہیز کر لیا بلکہ آئندہ اس نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

پاک دھرتی

فضلِ ربی راہیؔ

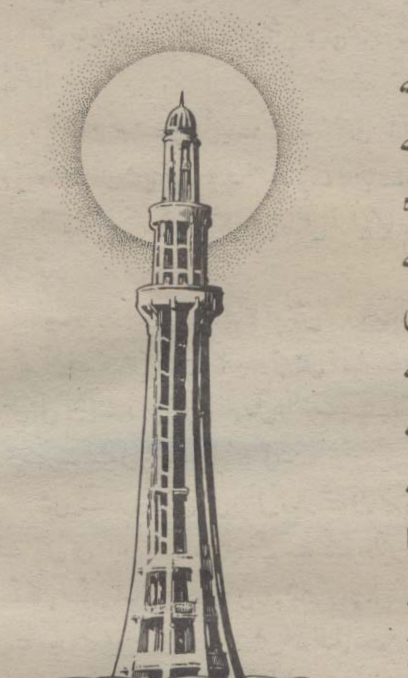

تجھ کو اے پاک دھرتی! جنّت نشاں کریں گے
ہم تیری عظمتوں کے نغمے بیاں کریں گے
بھر دیں گے روشنی سے ہر تیرا ذرّہ ذرّہ
اپنے لہو سے روشن، تیری فضا کریں گے
تو پاک سرزمیں ہے، تجھ کو اے پاک دھرتی
سارے جہاں سے بڑھ کر ہم خوش نما کریں گے
ہم نونہال سارے، تجھ کو نہ مٹنے دیں گے
دل اپنا، جان اپنی، تجھ پر فدا کریں گے
دنیا میں نام ہوگا، چرچا بھی عام ہوگا
علم و عمل کا ایسا روشن دیا کریں گے
دینا پڑا جو ہم کو، دیں گے لہو بھی راہیؔ
اپنے وطن کی خدمت یوں ہی سدا کریں گے

جہانِ نو

محمد صالح ارشاد

مستقبل کا جہاز

دس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے دیوہیکل ۷۴۷ کے مسافر لاؤڈ اسپیکر سے یہ اعلان سنتے ہیں۔

"خواتین و حضرات ہمارے جہاز کے انجن میں آگ لگ گئی ہے اور اب ہم ایمرجنسی لینڈنگ کریں گے اس لئے آپ اپنے حفاظتی بند باندھ لیں" اعلان سننے کے بعد مسافر اطمینان سے اپنے حفاظتی بند باندھ کر یوں بیٹھ جاتے ہیں جیسے انہیں جہاز کی ایمرجنسی لینڈنگ کے بجائے مٹھائی بانٹنے کی خبر سنائی ہو۔

تھوڑی دیر بعد کپتان اور اس کے معاون بھی اپنے کیبن سے نکل کر مسافروں کے کمپارٹمنٹ میں آتے ہیں اور دروازے کو بند کر دیتے ہیں۔ جیسے انہیں...... اب جہاز ہی نہیں اڑانا۔ پھر کپتان ایک بٹن دباتا ہے اور مسافروں کا کمپارٹمنٹ باقی ماندہ جہاز سے الگ ہو کر پیراشوٹ کی مدد سے فضا میں اڑنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ نیچے اترتا جاتا ہے۔

مستقبل کے جہازوں کیلئے یہ خیال ایک سابقہ

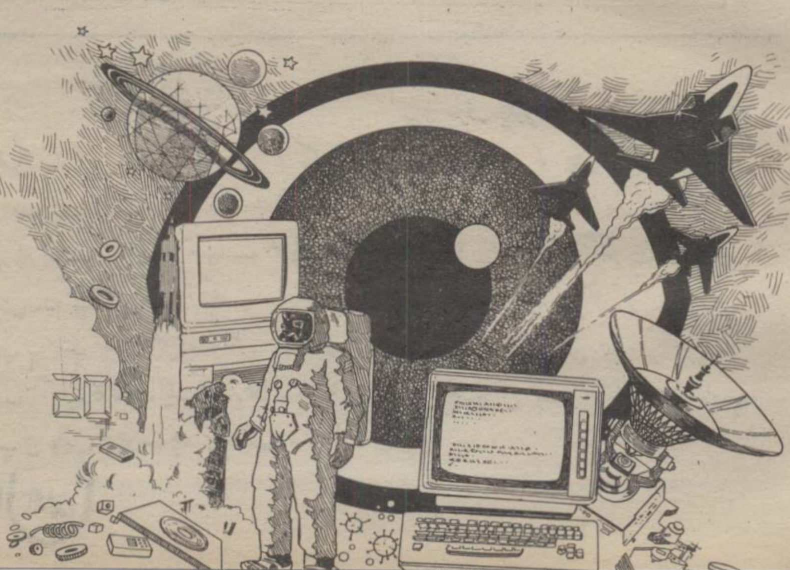

پائلٹ پیٹر ڈائمنڈ (PETER DIAMOND) نے پیش کیا ہے۔

اس کے نظریہ کے مطابق مسافروں کا ڈبہ جہاز سے بالکل الگ ہوگا اور اسے جہاز میں الگ سے فٹ کیا جائیگا۔

خطرناک صورتحال کے موقع پر بٹن دباتے ہی یہ حصہ جہاز سے الگ ہو کر پیراشوٹ کی مدد سے زمین پر بہ حفاظت اتر جائے گا چونکہ ڈبے میں کسی بھی قسم کا ایندھن وغیرہ نہیں ہوگا اس لئے اس میں آگ لگنے کا خدشہ نہیں ہوگا۔

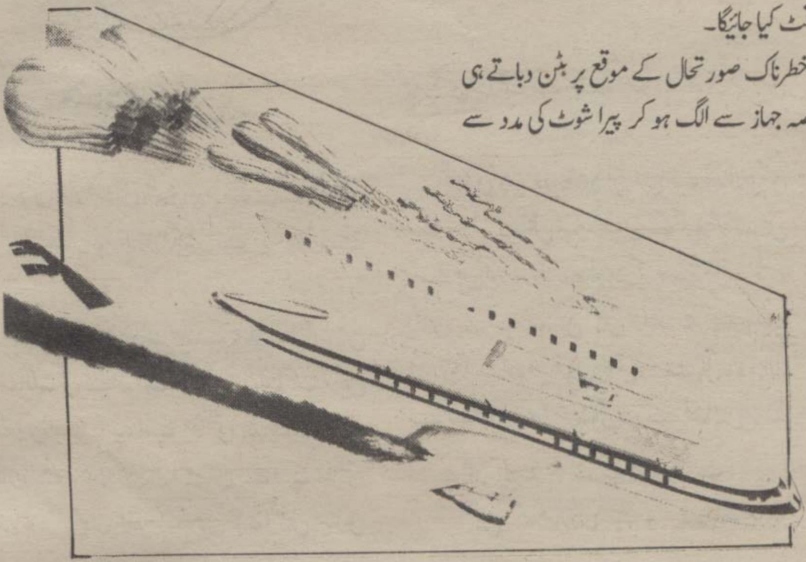

کمپیوٹر شطرنج

شطرنج کے کھیل کو اکیلے کھیلنے میں مزہ نہیں آتا۔ اسے کھیلنے کیلئے مخالف کا ہونا بہت ضروری ہے اور پھر مخالف بھی ایسا جو آپ کے ہم پلہ ہو یعنی جس سے کھیلنے میں لطف آسکے۔

اب یہ مسئلہ کمپیوٹر چیس نے حل کر دیا ہے یعنی اب آپ کا مخالف ایک کمپیوٹر ہوا کرے گا جو آپ کی چالوں کا جواب چند سیکنڈ میں دے دیا کرے گا۔

یہ نہ صرف چالوں کے جواب دیتا ہے بلکہ چلی جانے والی چالوں کو بیان بھی کرتا ہے۔ (SKION MEMORY CHIP) کی مدد سے یہ آواز کے الیکٹرانک سگنلز بتاتا ہے جنہیں ایک چھوٹے سے اسپیکر کو منتقل کر دیا جاتا ہے جو مصنوعی آواز کی صورت میں سنائی دیتے ہیں۔

اس شطرنج کی قیمت تقریباً ۵ ہزار روپے ہے۔

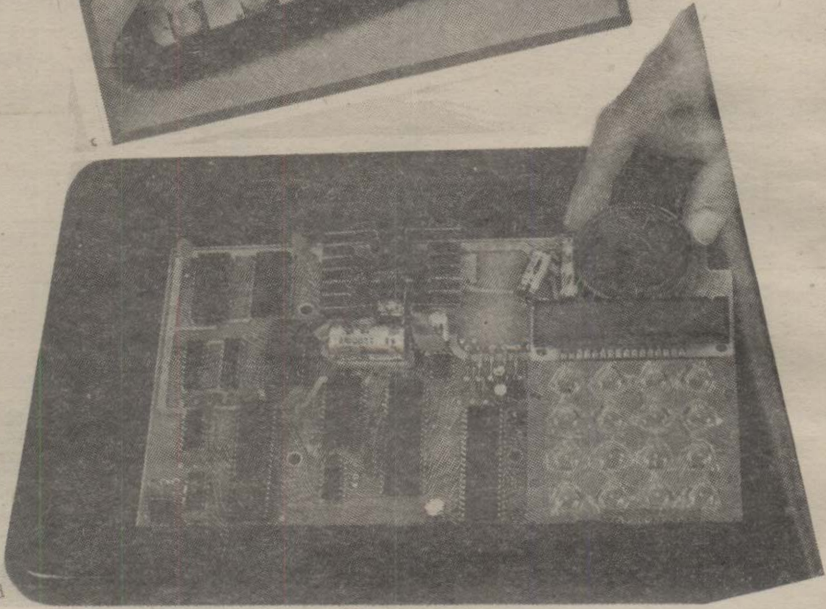

جیبی مائیکرو اسکوپ

سگریٹ کی ڈبیا کے برابر ڈبہ جیب سے نکالیں اور بٹن دبائیں ، لیجئے آپ کا مائیکرو اسکوپ تیار

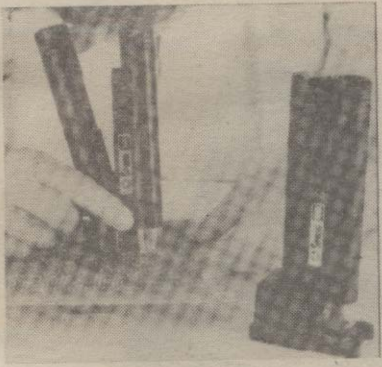

ہے۔ اب آپ اپنی ورکشاپ میں کسی باریک سرکٹ یا بائیالوجی لیب میں کسی جانور کا بغور جائزہ لے سکتے ہیں۔

۴۶۵ اونس وزنی اور ۲۰ ڈالر قیمت کی یہ مائیکرو اسکوپ

SOLDAR ABSORBING TECHNOLOGY, 144 OAKLAMD

نے تیار کی۔

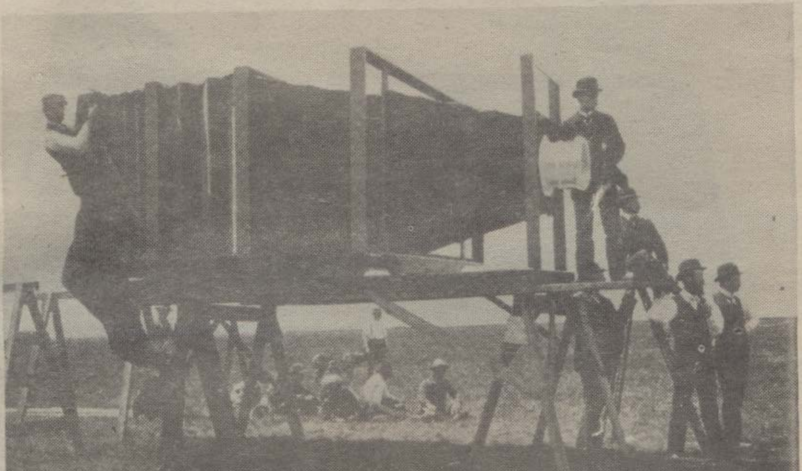

۱۹۰۰ء میں شگاگو ریلوے کمپنی نے ایک لگژری ٹرین کی تصویر کھینچنے کے لئے یہ دیو قامت کیمرہ استعمال کیا تھا۔ کیونکہ پوری ریل گاڑی کی تصویر لینے کا کوئی اور طریقہ اس زمانے میں نہ تھا۔ اس کیمرے کی لمبائی ۱۲ فٹ تھی اور وہ دروازے کے برابر تصویر کھینچ سکتا تھا۔

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:- ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:- ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:- ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:- ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:- ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:- ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:- ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیمیار خان فون:- ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:- ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:- ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بُک ڈپو۔ فیصل آباد فون:- ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بُک اسٹال۔ گجرات فون:- ۰۴۳۳۱	مسلم بُک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:- ۲۴۱۴	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۳، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

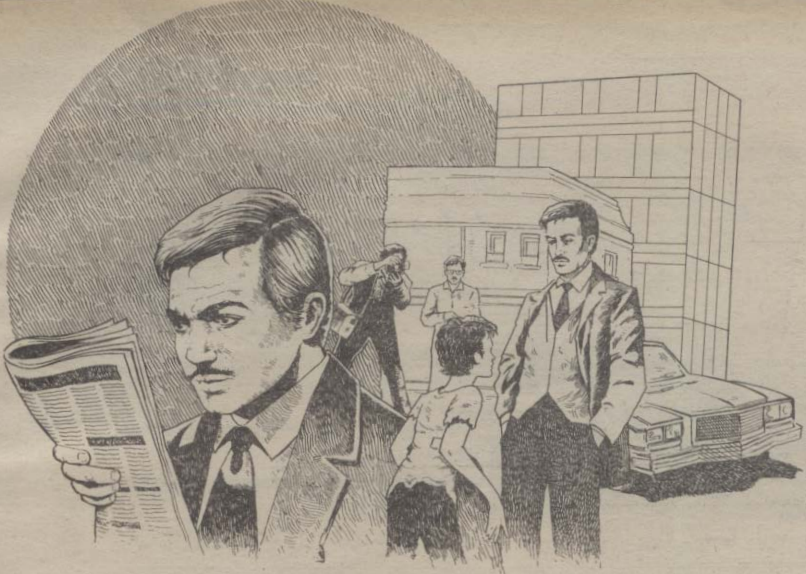

خدایا شکر ہے

صلاح الدین عباسی

مشہود احمد مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی کانفرس ہال پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا سیکریٹری رحمت علی بھی تھا۔ جیسے ہی مشہود احمد اپنی بڑی سی کار سے نیچے اترے انہیں ایک فقیر بچے نے گھیر لیا۔

"بابو جی اللہ تمہیں اس سے بھی بڑی کار دے گا .... مجھے کھانا کھانے کے پیسے دے دو .... دو دنوں سے فاقہ ہے۔" بچہ بڑی لجاجت سے بولا۔ بچے کو دیکھتے ہی مشہود احمد کا منہ بن گیا۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ نفرت کے تاثرات پھیل گئے۔ انہوں نے پہلے اپنے سیکریٹری رحمت علی کی طرف دیکھا اور پھر بچے کو بُری طرح جھڑک دیا۔ بچے نے بارہا التجا کی .... خدا رسول کے واسطے دیئے مگر مشہود احمد کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ رحمت علی کا بڑا دل چاہا کہ وہ دو روپے بچے کے ہاتھ پر رکھ دے مگر ایسا کر کے وہ اپنے پیٹ پر لات نہیں مارنا چاہتا تھا۔

"یہ بچہ بڑا احمق ہے۔ اسے اس وقت بھیک نہیں مانگنی چاہتے تھی۔" کانفرنس روم کے بڑے

سے داخلی دروازے میں سے اندر داخل ہوتے ہوئے مشہود احمد ناگواری سے بڑبڑائے۔

"تو پھر کس وقت مانگنی چاہئے تھی سر۔؟" رحمت علی مودبانہ لہجے میں بولا۔

مگر مشہود احمد اسے جواب دینے کے بجائے کانفرنس ہال کے عملے سے ضروری بات چیت کرنے میں مصروف ہوگئے۔

مشہود احمد امریکا سے بچوں کی سوشل لائف کے بارے میں ایک دو سالہ کورس مکمل کر کے حال ہی میں وطن لوٹے تھے اور یہاں اس سلسلے میں انہوں نے ہوٹل فورم ان (Forum In) کے کانفرنس ہال میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ جس میں کئی سماجی شخصیتوں، بعض وزراء اور اہم شہریوں کے ساتھ اخباری رپورٹرز کو بھی بلایا گیا تھا، تاکہ ان سب کے سامنے مشہود احمد اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کر سکیں۔

کچھ دیر بعد کانفرنس ہال پورے کا پورا لوگوں سے بھر گیا۔ اور پھر چند لمحوں بعد مشہود احمد جوشیلے انداز میں خوبصورت اور جذباتی جملوں کے جال حاضرین کی طرف پھینک رہے تھے۔ سیکریٹری رحمت علی بڑی حیرت اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے عالم میں انکی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس قسم کے بلند و بانگ دعوے مشہود احمد کر رہے تھے انکا نمونہ رحمت علی کچھ دیر قبل کانفرنس ہال کے دروازے پر دیکھ چکا تھا۔ کافی دیر بعد کانفرنس ختم ہوئی تو مشہود احمد بے حد مطمئن نظر آرہے تھے۔ کئی بااثر شخصیتوں نے ان سے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ رپورٹرز کے ساتھ آئے ہوئے فوٹو گرافرز کے کیمرے بار بار مشہود احمد کی جانب اٹھتے اور کھڑچ کی آواز کے ساتھ فلش پھینکتے۔

آہستہ آہستہ سب لوگ مشہود احمد کو ان کے اعلیٰ خیالات اور عظیم منصوبے پر مبارک باد دیتے ہوئے رخصت ہونے لگے۔ جب سب لوگ رخصت ہوگئے تو مشہود احمد نے ایک طویل سانس خارج کی اور فاتحانہ نظروں سے سیکریٹری رحمت علی کی طرف دیکھنے لگے۔

"چلیں سر۔!" رحمت علی سر کو جھکاتا ہوا بولا۔

"ہاں چلو۔" مشہود احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انہوں نے کانفرنس ہال کے انچارج کو تمام معاملات فون پر طے کرنے کے لئے کہا۔ اور پھر وہ رحمت علی کے ساتھ باہر آگئے۔ باہر وہی لڑکا موجود تھا۔ جسے شاید ہال سے نکلنے والے کسی بھی شخص نے بھیک نہیں دی تھی۔ اسے دیکھ کر مشہود احمد کے چہرے پر دوبارہ ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ وہ کوئی سخت جملہ کہنا چاہ ہی رہے تھے کے اچانک تاثرات بدل گئے۔ ان کا چہرہ جو کہ چند لمحے قبل صحرا کی ریت اڑا رہا تھا اب گلستان بن چکا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر نہ صرف فقیر بچے کے گال پر بوسہ دیا بلکہ سو کا ایک نوٹ بھی دیا۔ رحمت علی نے پھٹی پھٹی آنکھوں کے

ساتھ یہ ماجرا دیکھا۔ یکایک اس کایا پلٹ نے اسے بے حد حیران کر دیا تھا۔ بہر حال ماتحت ہونے کی وجہ سے وہ مشہود احمد سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا۔

○............ ○○ ....○

دوسرے دن مشہود احمد جیسے ہی جاگے انہوں نے سیکریٹری رحمت علی کو فوراً "روزنامہ نئ صبح" کا پرچہ لانے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر رحمت علی کو بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ پریس کانفرنس میں ملک کی تمام اخبارات کے نمائندے شامل تھے پھر وہ صرف "نئ صبح" کا پرچہ کیوں منگوا رہے تھے۔ خیر چوں کہ رحمت علی پہلے سے ہی تمام اخبارات لا چکا تھا۔ اس لئے اس نے ان تمام اخبارات میں سے نئ صبح کا پرچہ نکالا اور مشہود احمد کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مشہود احمد نے جو بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے تقریباً جھپٹ کر اس سے اخبد لیا اور اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ رحمت علی تعمیلِ حکم میں کمرے سے باہر تو آگیا مگر سُن گُن لینے کے لئے وہیں دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کچھ دیر تک تو اخبار کی سرسراہٹ کی آوازیں آتی رہیں پھر خوشی سے بھرپور ایک با آواز بلند نعرہ بلند ہوا............ "خدایا شکر ہے۔ شکر ہے تیرا میرے مولا کہ میں نے "نئ صبح" کے فوٹو گرافر کو دیکھ لیا تھا۔ ورنہ............ ورنہ شاید میرا مستقبل تباہ ہوجاتا۔ خدایا تیرا شکر ہے۔"

رحمت علی حیرت سے گُنگ بت بنا یہ آواز سنتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ الف بے بالکل بھی نہیں آئی تھی۔ کافی دیر تک اخبارات کی اتھل پتھل کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن کر رحمت علی تیزی سے کمرے میں گھس آیا۔ فرش اور بستر پر اخبارات ہی اخبارات پھیلے ہوئے تھے جو کہ اس نے "نئ صبح" کے ساتھ وہاں پہنچائے تھے۔ جبکہ "نئ صبح" میز پر تہہ کیا ہوا پڑا تھا۔ رحمت علی نے مشہود احمد کی طرح جھپٹ کر وہ اٹھایا اور صفحات پر نظریں دوڑانے لگا۔ دو تین صفحات پلٹنے کے بعد اچانک اس کی نظریں ایک جگہ اٹک گئیں۔ چند لمحوں تک وہ اس جگہ کو گھورتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ پھیل گئی۔ کانفرنس ہال میں سے نکلتے ہوئے جب وہی فقیر لڑکا دوبارہ بھیک مانگنے کے لئے مشہود احمد کی طرف بڑھا تھا تو مشہود احمد کا ارادہ اسے دوبارہ لتاڑنے کا تھا مگر اچانک ان کی نظریں رونامہ "نئ صبح" کے رپورٹر اور فوٹو گرافر پر پڑ گئیں جو کہ ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب انہوں نے ارادہ بدل کے نہ صرف اس بچے کو پیار کیا تھا بلکہ سو کا ایک کرارہ نوٹ بھی دیا تھا۔ بوسہ دینے اور نوٹ دینے کے دونوں لمحات فوٹو گرافر نے اپنے کیمرے میں قید کر لئے تھے۔ جنہیں اس نے آج اخبار میں شامل کر دیا تھا۔ سیکریٹری رحمت علی دونوں تصاویر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "خدایا شکر ہے کہ تو نے میرے مالک کو پبلسٹی کا موقع عنایت کیا۔" پھر وہ اپنی سوچ پر مسکرانے لگا۔

گھٹن

محمد عارف انیس

آج میں بہت بیزار تھا اور اس بیزاری کی بھی ایک نہیں کئی وجوہات تھیں۔ میں اپنی مشینی زندگی سے ناخوش تھا۔ وقت پر سو جاؤ وقت پر اٹھ جاؤ اور پھر خاک، دھواں، دھول پھانکتے ہوئے دفتر چلے جاؤ۔ اپنے ماتحتوں کی مصنوعی مسکراہٹوں کے جواب میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کمرے میں جاکر فائلوں کے ڈھیر میں گم ہو جاؤ۔ اور پھر شام کو دوبارہ گرد پھانکتے ہوئے گھر کا رخ کرو۔ صبح پھر وہی میں اور وہی جھمیلے. کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے میں ایک گوشت پوست کا بنا ہوا روبوٹ ہوں جس کا کنٹرول کسی ان دیکھی طاقت کے ہاتھ میں ہو۔ میری اپنی کوئی مرضی نہ ہو۔ سچ پوچھئے تو میں اس مشینی زندگی سے بُری طرح اُکتا چکا تھا۔

میں نے ایک لحظہ کے لئے فائلوں کے انبار پر نظر دوڑائی اور پھر ایک طویل سانس لی۔ باہر، اف

ٹریفک کا کان پھاڑ دینے والا شور، گرمی، حبس، فضا میں تیرتے ہوئے مٹی کے ان گنت ذرات۔ کسی کے چہرے پر بھی سچی مسکراہٹ نظر نہیں آتی۔ "شاید بھری دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں، مطمئن نہیں۔" میں نے سوچا۔

حالانکہ تمام لوگ صرف اپنی خوشی کے لئے ہی تو سب کچھ حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ "یہ ہنگامے، شور، شرابا، ڈاکے چوریاں۔ محنت شہرت دولت" یہ سب کچھ خوشی کی خواہش ہی کی پیداوار ہیں۔ پھر لوگ خوش کیوں نہیں رہے؟" میرے ذہن میں الجھن سی تیر گئی۔

"ٹن" میں نے گھنٹی پر ہاتھ مارا اور چپڑاسی دین محمد چراغ کے جن کی مانند ظاہر ہوا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بوکھلا گیا۔ "بیٹھ جاؤ" اس دفعہ میں نے سرد لہجہ میں حکم دیا تو وہ ہچکچاتا ہوا کرسی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے ابھی اٹھ کر بھاگنے کی فکر میں ہو۔

چپڑاسی دین محمد بائیس سال سے ملازمت کر رہا تھا اور اب ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ جھریوں نے اس کے چہرے پر ابھی سے جال بننے شروع کر دیئے تھے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ خوش ہے؟ جبکہ وہ چہرے پر بدحواسی طاری کئے میز پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"ادھر دیکھو دین محمد۔" میں نے اس دفعہ نرمی سے کہا۔ "میرے ایک سوال کا جواب دو گے؟" اس کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے زردی چھا گئی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہوں" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟" میرے عجیب سوال نے اسے بوکھلا دینے کی بجائے حیرت زدہ کر دیا۔

"جی ہاں۔" اس نے کھنکار کے کہا...... "میں بالکل خوش ہوں۔"

اس دفعہ حیران ہونے کی باری میری تھی "کیا تم بالکل خوش ہو؟ بالکل؟"

"جی ہاں وہ دبے دبے سے لہجے میں بولا۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے بس ایک ہی خواہش ہے کہ میرے بچے پڑھ لکھ جائیں اور میں اپنا کوئی مکان بنا لوں۔"

"اوہ" ...... میرے منہ سے ایک طویل سانس نکلی، "تم جا سکتے ہو۔" دین محمد کرسی سے اٹھا اور مجھے حیرت سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ہوں تو خواہش نے یہاں بھی خوشیوں کا خون کر دیا اور دین محمد جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا۔ لیکن میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ میں کوئی ایسا انسان ضرور تلاش کر لوں گا جو بالکل خوش ہو۔ خواہشات سے پاک اور یہ تلاش مجھے ابھی سے شروع کر دینی چاہئے۔" میں نے اپنا استعفیٰ ٹائپ کروایا اور پھر اپنے چیف کے پاس پہنچا۔

عظیم صاحب پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہمارے ادارے کے سربراہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حقیقی معنوں میں انہیں دولت اور شہرت سے مالا مال کیا ہوا تھا انہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گئے

"خیر تو ہے مسٹر شاہد؟ انہوں نے ایک فائل دیکھتے ہوئے سوال کیا۔"

"یس سر۔ لیکن میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا تو انہوں نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔

"کہو کیا بات ہے؟" ان کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا تاثر تھا۔

"سر۔ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟" میں نے جلدی سے سوال داغ دیا۔ میرا عجیب و غریب سوال سن کر ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں لیکن پھر وہ مسکراتے ہوئے بولے "اچھا تو سروے ہو رہا ہے۔ میں بالکل مطمئن ہوں لیکن ایک خواہش ہے کہ کسی طرح ہمارا حمایت یافتہ امیدوار انتخابات میں کامیاب ہو جائے اور اس کے وزیر اعظم بننے کی صورت میں ہمیں ٹیکس کی چھوٹ مل جائے۔" میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ہمارے ملک کا امیر ترین آدمی بھی ناخوش تھا۔

"تو پھر خدا حافظ سر۔" میں نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ "میرا یہ استعفیٰ قبول کر لیں"۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!" باس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "بس سر ایک خاص وجہ ہے اور اگر آپ مجھے پاگل نہ سمجھیں تو بتائے دیتا ہوں۔ میں خوشی کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔"

"خوشی کی تلاش!" ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"سر اس دنیا میں آپ سے لے کر چپڑاسی دین محمد تک کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ میں کسی ایسے انسان سے ملنا چاہتا ہوں جو ہر حال میں خوش ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایک مطمئن اور قانع شخص کیسا ہوتا ہے اور بس۔"

"میں سمجھ گیا! تو پھر سچ سن لو میں اپنی زندگی سے بالکل غیر مطمئن ہوں۔ بے خوابی، اعصابی بے چینی اور ذہنی انتشار کے باعث تمام تر آسائشوں سے نفرت کرتا ہوں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کاش میں کوئی غریب کسان ہوتا۔ لیکن وہ بھی تو مطمئن نہیں ہے۔ تم جاؤ میری تمام دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ لیکن تم ایک شرط پر جا سکتے ہو۔"

"شرط!" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں نے کافی عرصہ قبل ایک روایت سنی تھی کہ اگر کسی مطمئن قانع اور خوش شخص کی قمیص پہن

لی جائے تو تمام الجھنیں اور دکھ غائب ہو جاتے ہیں۔ پلیز۔ تم میرے لئے اس شخص سے قمیص لیتے آنا۔ چاہے اس کے لئے لاکھوں روپے ادا کرنے پڑیں۔ میری اس سوچ پر قہقہے نہ لگانا انسان چاہے مریخ پر ہی نہ پہنچ جائے وہ سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اب تم جاؤ استعفیٰ دینے کی ضرورت نہیں، میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ "عظیم صاحب نے تمام تر تکلّفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا اور میں استعفیٰ جیب میں ڈال کر انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

میرے سامنے ریگستان پہاڑ دریا میدان پھیلے ہوئے تھے اور ان میں بسنے والے انسان مجھے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ بالکل کسی روبوٹ کی مانند حرکت کرتے ہوئے ان کے چہرے پر زندگی کی بہت معمولی سی رمق ان کے انسان ہونے کا پتہ دے رہی تھی اور مجھے انسانوں کے اس سمندر میں کسی خوش مطمئن اور قانع شخص کی تلاش تھی اور کون جانتا تھا کہ یہ تلاش کتنی لمبی ہوگی۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک لنگڑے فقیر پر پڑی جو کشکول ہاتھ میں تھامے صدا لگا رہا تھا۔ میں نے پانچ روپے کا نوٹ کشکول میں ڈال دیا۔

"بابا ایک سوال کا جواب دو گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ایک نہیں ہزار پوچھو موتیوں والی سرکار۔" وہ میری فیاضی سے خوش ہو کر بولا۔

"مجھے بتاؤ کہ کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو معذور ہونے کے باوجود؟"

"ہاں بابا فقیر تو خوش ہوتا ہے ہر حال میں ٹھوکریں کھانے کے باوجود .... لنگڑا لولا ہونے کے باوجود .... بس کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر لنگڑا ہونے کے ساتھ اندھا بھی ہوتا تو پھر بڑے عیش ہوتے خوب کمائی ہوتی؟" میں مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے میرا گزر ایک باغ میں سے ہوا جہاں ہمہ قسم پھلدار درخت خوب بہار دکھا رہے تھے۔ میں نے باغ کے مالک کے چہرے پر چھائی ہوئی مسکراہٹ دیکھی اور رک گیا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر دگنی رونق آ گئی اور والہانہ انداز میں میرے استقبال کے لئے بڑھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اپنی منزل پا چکا ہوں۔

"پیارے بھائی کیا تم ہمیشہ یونہی خوش رہتے ہو؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

ہاں میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں وہ کھلکھلایا۔ لیکن کاش۔ اس کی آنکھوں میں غم کے سائے نظر آئے۔ کاش موسم خزاں کبھی نہ آتا درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے پرندے چہچہاتے رہتے۔ اے کاش۔ میں مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔

اس دفعہ میرا گزر ایک بادشاہ کے سامنے سے ہوا جو ایک انتہائی عظیم الشان دربار لگائے بیٹھا تھا

درباری اس کی تعریفوں میں رطبُ اللّسان تھے۔ وہ مسخرے کی حرکتیں دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا میں نے سوچا اس شخص کو کسی چیز کی کمی نہیں اور جس طرح یہ قہقہے لگا رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے دنیا بھر کی خوشیاں میسر ہیں۔ میں نے جان کی امان پا کر اپنے سوال دہرایا تو وہ یکلخت افسردہ ہو گیا۔

"اجنبی۔ ہمیں دنیا کی ہر آسائش میسر ہے لیکن کاش ہمارا کوئی بیٹا ہوتا جسے ہم اپنا ولی عہد بنا سکتے۔ کاش ہمارا کوئی بیٹا ہوتا۔"

پھر میں ایک کسان کے سامنے سے گزرا جو لہک لہک کر گیت گا رہا تھا ہل چلا رہا تھا اور مسکرائے جا رہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہی دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہے میں نے حسب معمول اس کے سامنے سوال دہرایا تو وہ رک گیا۔

"ہاں تم سچ کہتے ہو میں بالکل خوش رہتا ہوں۔ اپنی ذات سے متعلق کچھ بھی سوچ کر اداس نہیں ہوتا ہر وقت خوشی کے گیت گاتا رہتا ہوں لیکن کبھی ایک خواہش مجھے افسردہ کر دیتی ہے کہ کاش اس دنیا میں موت نہ ہوتی تو یہ دنیا کتنی حسین ہوتی؟ میں آگے بڑھ گیا۔

مسلسل ناکامیوں کے باوجود میں نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ پہاڑوں میدانوں ریگستانوں کو چھان مارا لیکن اپنا گوہر مقصود نہ پا سکا۔ آخر کار میں تھک ہار کر ایک چٹان کے نیچے جا بیٹھا جہاں کافی اندھیرا چھایا ہوا تھا میں بے اختیار بڑبڑایا۔

"زندگی میں کس قدر تکلیف ہے، کس قدر تاریکی ہے۔"

"نہیں میرے دوست! زندگی تو روشنی ہی روشنی ہے۔ قصور تو دیکھنے والے کی آنکھوں کا ہوتا ہے زندگی خوشی ہے، گیت ہے، آسودگی ہے اور بس۔" مجھے اپنے قریب سے آواز سنائی دی میں نے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا وہاں ایک اور شخص موجود تھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنا مدعا پا لیا ہو "کیا تم ہمیشہ خوش رہتے ہو، کوئی خواہش تمہیں اداس نہیں کرتی؟" میں نے خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "ہاں ہمیشہ خوش رہتا ہوں، خوش قانع اور مطمئن زندگی کی رگوں سے مسکراہٹ کشید کرتا ہوں۔ وہ زور سے ہنسا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خوشی سے پاگل ہو گیا ہوں۔ میں تیزی سے اس کے قریب سرک گیا "تو پھر خدا کے لئے اپنی قمیص دے کر مجھے خوشی دے دو۔" "میں ایسا ضرور کرتا لیکن..... میری درخواست سن کر وہ بڑبڑایا۔

"لیکن کیا؟ خدا کے لئے میری مدد کرو" اور پھر جیسے ہی میں نے اپنا ہاتھ اس کے جسم سے لگایا تو سکتے میں رہ گیا مطمئن قانع اور خوش شخص کے جسم پر قمیص ہی نہیں تھی۔

تعصب

وقار عادل شیخ

گزارش ہے کہ اہلِ ہوش سن لیں التجا میری
وگرنہ آگ بن کر پھیل سکتی ہے صدا میری

گذشتہ اک دہائی میں نجانے کیا ہوا ہم کو
علاقائی تعصب کا جہنّم کھا گیا ہم کو

بہت سے لوگ مجبورِ تلاشِ عافیت ہو کر
وطن ہی چھوڑ بیٹھے ہیں شکارِ عصبیت ہو کر

کسی دفتر میں جاؤ اک عجب بحران دیکھو گے
جہاں دیکھو گے نظم و ضبط کا فقدان دیکھو گے

بہت کم لوگ ہیں جو درحقیقت کام کرتے ہیں
وگرنہ بیشتر نا اہل ہیں آرام کرتے ہیں

حکومت کے ملازم دوسری سروس بھی کرتے ہیں
یقیں کیجئے کہ ان میں بیشتر بزنس بھی کرتے ہیں

بہت سے دفتروں کو گھر سمجھ بیٹھے ہیں خالہ کا
تحفّظ چونکہ حاصل ہے انہیں حکّامِ اعلیٰ کا

یہ سازش اندرونی ہے کہ بیرونی سیاست ہے
بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے

کسی بھی رہنما کو کاش یہ احساس ہو جائے
تدبّر سے وہ اہلِ علم و دانش کو یہ سمجھائے

مسلماں ہو کے آپس میں یہ کوتا بَندیاں کیسی
دلوں کے جذبۂ تعمیر پر پابندیاں کیسی

سمٹ کر رہ گئی جو قوم صوبوں میں، زبانوں میں
یونہی تقسیم ہو سکتی ہے آئندہ زمانوں میں

تعصب جس کے دل میں ہو مسلماں ہو نہیں سکتا
محمد ؐ کی شریعت کا نگہباں ہو نہیں سکتا

تعصب ایک ڈاکہ ہے ترقّی کے خزانے میں
خصوصاً ٹیکنالوجی کے اس نازک زمانے میں

ترقّی کی جو دل میں ہے تمنّا ایک ہو جاؤ
تعصّب ختم کر ڈالو خدارا ایک ہو جاؤ

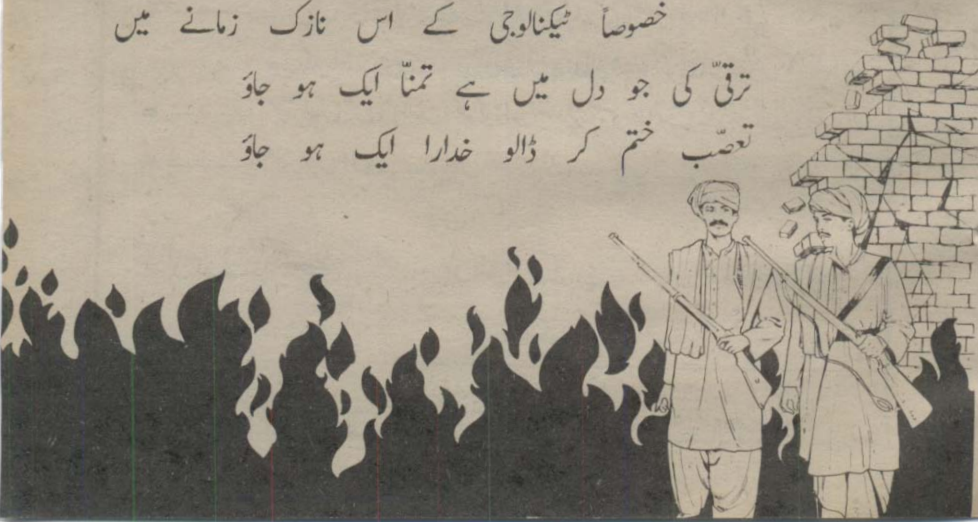

منہ نہ بنائیے

سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

- ★ ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
- ★ ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
- ★ ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
  یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔
- ★ ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
- ★ ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے — سبزیاں شوق سے کھائیے — ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

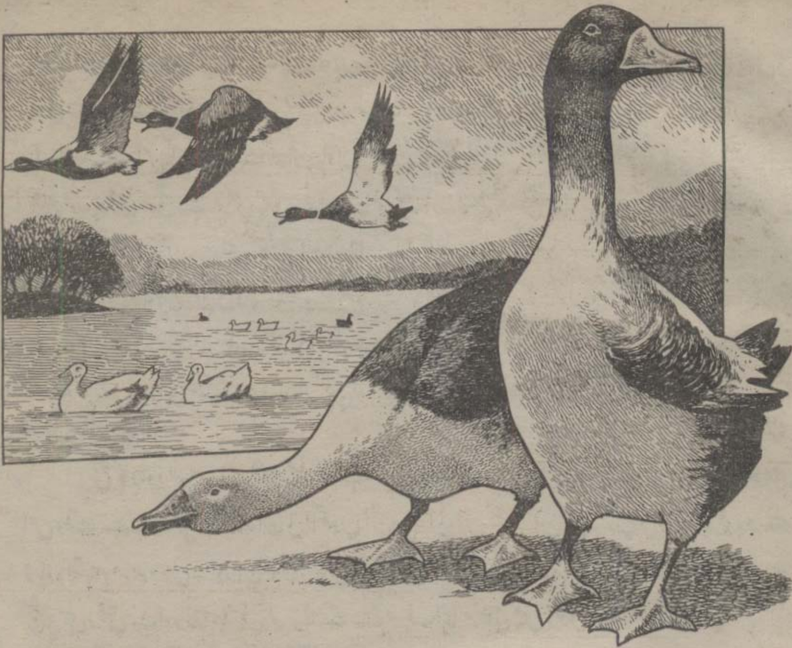

بطخ

عامر یونس

بطخ ایک پرندہ ہے۔ جس طرح کبوتر، چیل، کوّا اور دیگر چڑیاں پرندہ ہیں اسی طرح بطخ بھی پرندوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پرندہ وہ جانور ہوتا ہے جو ہوا میں اڑ سکتا ہو اور جس کے جسم کا درجۂ حرارت یکساں رہتا ہو۔

بطخ دراصل پانی میں رہنے والا پرندہ ہے۔ یعنی یہ وہ جانور ہے جو اڑنے کے ساتھ ساتھ پانی میں تیر بھی سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ عام پرندوں کے مقابلے میں ذرا مختلف شکل و صورت کا مالک ہے۔

ظاہری طور پر بطخ کا جسم چھوٹا اور گول مٹول سا ہوتا ہے۔ اس کی گردن چھوٹی اور ٹانگیں جسم کے پچھلے حصے کی

طرف ہوتی ہیں۔ پیر بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور پنجے میں تین انگلیاں ہوتی ہیں جن کے درمیان کھال کی جھلی ہوتی ہے۔ پاؤں کی ایک انگلی کا رخ پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اس قسم کے پاؤں دوسرے پرندوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پاؤں کی مدد سے بطخ پانی میں با آسانی تیر سکتی ہے۔ پھر بطخوں کی چونچ چپٹی اور چوڑی ہوتی ہے۔ پر بھی چھوٹے اور ذرا نوکیلے ہوتے ہیں۔ بطخ کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے پر موجود ہوتے ہیں جن سے اس کا جسم ڈھکا رہتا ہے اور آس پاس کے موسم سے محفوظ بھی رہتا ہے۔ پھر یہ پر رنگین بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ خوبصورت بھی نظر آتی ہیں۔ بطخوں کی مختلف اقسام کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ کچھ سیاہ اور سفید رنگ کی ہوتی ہیں تو بعض انتہائی شوخ رنگوں کی مثلاً چمک دار سبز، گہرا سرخ، گہرا نارنجی اور بھورا۔ سب سے زیادہ رنگین اور خوبصورت بطخ "مندارن" بطخ ہوتی ہے جو پاکستان میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

بطخ کا وجود انسان سے بھی پہلے کا ہے۔ یہ کوئی پندرہ کروڑ سال پہلے سے زمین میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کی لاکھوں قسمیں آئی ہیں لیکن آج کل بطخوں کی ایک سو پندرہ سے کچھ زیادہ اقسام موجود ہیں۔ اور ان کو تین بڑی اقسام میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو پانی کی صرف سطح پر ہی رہتی ہے اور غذا حاصل کرنے کے لئے صرف اپنا سر پانی میں ڈبوتی ہے۔ یہ بطخوں کی عام قسم ہوتی ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے مثلاً ملارڈ بطخ۔

دوسری قسم کی بطخیں وہ ہیں جو کہ غوطہ خور بطخیں ہوتی ہیں۔ یہ خوراک حاصل کرنے کے لئے پانی کے اندر باقاعدہ غوطہ لگاتی ہیں۔ یہ بہت عمدگی سے تیرتی ہیں اور بعض اوقات سمندر میں بھی رہتی ہیں۔ ان کی چونچ پتلی ہوتی ہے تاکہ مچھلی کا شکار کر سکیں۔ کیونکہ ان کی غذا مچھلی ہوتی ہے۔ اس قسم کی بطخوں میں مرگانزر اور آئیڈر نامی بطخیں آتی ہیں۔

تیسری قسم وہ ہے جو خشکی پر رہتی ہے اور کبھی کبھار پانی میں چلی جاتی ہے۔ لہٰذا خشکی پر رہنے کے لئے اور چلنے پھرنے کے لئے بقیہ بطخوں کے مقابلے میں ان کے پیر ذرا بڑے ہوتے ہیں اور لمبے بھی۔ اس قسم کی بطخیں درختوں پر اپنا گھونسلا بناتی ہیں۔ مثلاً ووڈ اور مسکوی بطخ۔

اکثر بطخوں کا گھر پانی کے قریب ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ بطخ پانی میں رہنا پسند کرتی ہے سوائے اس تیسری قسم کے جو خشکی پر زیادہ وقت گزارتی ہے۔ بطخیں دریاؤں، جھیلوں، نہروں، تالاب یا جوہڑ کے آس پاس ہی رہتی ہیں۔ بلکہ بعض اقسام تو سمندر میں بھی رہتی ہیں۔ قدرت نے ان کو سمندری پانی پینے اور اس میں سے زائد نمک علیحدہ کرنے کا خاص انتظام دیا ہوا ہے۔ بہرحال زیادہ تر بطخیں تازہ پانی اور جھیلوں میں ہی رہتی ہیں۔ ان کے گھر یا گھونسلے پانی کے کنارے جھاڑیوں میں یا پھر درختوں کے اوپر بھی ہوتے

ہیں۔ اور جہاں صرف گھاس موجود ہو تو پھر اس میں ہی یہ گھونسلا بنا لیتی ہیں۔ گھونسلا گھاس پھوس کا بنا ہوا ہوتا ہے اور اس کی اندرونی جگہ پر بطخ اپنے جسم کے چھوٹے چھوٹے پروں کا بستر بچھا لیتی ہے۔

سال میں ایک دفعہ مادہ بطخ انڈے دیتی ہے۔ ایک موسم میں دس سے بیس عدد تک انڈے دیتی ہیں۔ اسی وقت یہ بطخ جھٹک کر اپنے جسم کے تمام پر گرا دیتی ہے۔ اس طرح اس کے جسم سے گرمی بغیر کسی رکاوٹ کے انڈے تک پہنچ جاتی ہے اور اسی عرصے میں وہ اڑنے سے بھی قاصر ہوتی ہے۔ نئے پر اگنے میں چار سے پانچ ہفتے لگ جاتے ہیں۔ بطخ کے انڈے بے داغ سفید یا مٹیالے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کا سائز مرغی کے انڈے کے قریب قریب برابر ہوتا ہے۔ مگر بطخ کا انڈا مرغی کے انڈے سے ذرا سا لمبا ہوتا ہے۔

جب انڈے سے بچہ نکلتا ہے تو بطخ ان کے پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کو پانی میں لے جاتی ہے اور یوں وہ چوزے فوراً تیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پر نہیں ہوتے ہیں لہٰذا وہ اڑ نہیں سکتے۔ جب چار پانچ ہفتوں کے بعد ان کے پر نکلتے ہیں تب جا کر وہ اڑنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ اس عرصے میں بطخ اپنے بچے کو کھانا کھلا کر موٹا تازہ کرتی ہے۔ اور ان کا کھانا یعنی غذا کیا ہوتی ہے۔ تو بھئی ان کا کھانا پودے جو پانی میں پائے جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بطخ جو غوطہ خور ہوتی ہیں مچھلیاں بھی کھاتی ہیں۔ بطخ ساتھ ساتھ پانی بھی پیتی ہے۔ مگر پانی کے ساتھ بہت ساری مٹی بھی ان کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ اب اللہ نے ان کی چونچ میں اسی مقصد کے لئے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے ہیں، یہ چھلنی کا کام دیتے ہیں اور مٹی علیحدہ کر دیتے ہیں۔

بطخ اپنے پیروں کی مدد سے تیرتی ہیں۔ ان کا گول مٹول سا جسم تو پانی کے اوپر رہتا ہے اور ٹانگیں پانی کے اندر۔ پھر ان کے پنجے جھلی کے ساتھ ہوتے ہیں جس کی مدد سے یہ پانی کو پیچھے دھکیل کر آگے کی طرف تیر لیتی ہیں۔ بطخ کے تیرنے کی رفتار ۵ - ۴ کلو میٹر فی گھنٹہ تک ہے۔ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تیزی سے تیر لیتی ہیں۔ غوطہ لگانے کے لئے بطخ پہلے اپنا سر اندر ڈبو لیتی ہے اور پھر بقیہ جسم پانی کے اندر یہ اپنے ٹانگوں اور بعض اوقات پروں کی مدد سے تیرتی ہے۔ بطخوں کے جسم میں پشت کی طرف دم کے ساتھ ایک غدود ہوتا ہے جو کہ تیل بناتا ہے۔ بطخ اس تیل کو چونچ کی مدد سے پورے جسم اور پروں پر مل دیتی ہے اس کی وجہ سے پر بالکل خشک بھی نہیں ہو پاتے اور گیلے بھی نہیں ہوتے اور یوں بطخ زیادہ وقت پانی میں گزار لیتی ہے۔ ایک عام بطخ تین سے پانچ فٹ تک غوطہ لگاتی ہے۔ جبکہ سمندر میں رہنے والی باقاعدہ غوطہ خور بطخیں پندرہ سے تیس فٹ غوطہ لگا لیتی ہیں۔

اڑنے کے لئے بطخ اپنے بڑے پر استعمال کرتی ہے۔ چھوٹی بطخ کا چونکہ وزن کم ہوتا ہے لہٰذا وہ کھڑے کھڑے ہی اڑ جاتی ہے جس طرح ہیلی کوپٹر اڑ جاتا ہے۔ جبکہ بڑی بطخوں کو اڑنے کے لئے پہلے "رن

وے" کی طرح دوڑنا پڑتا ہے اور پھر جاکر وہ ہوا میں "ٹیک آف" کرتی ہیں۔ اڑتے ہوئے بطخیں بعض دفعہ کرتب بھی دکھا دیتی ہیں اور قلابازیاں بھی کھاتی ہیں اور تیزی سے گول گھومتے ہوئے نیچے کی طرف گرتی ہیں۔ بطخ چالیس سے پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہیں اور جب کسی جہاز وغیرہ سے ڈر جائیں تو پچھتر (۷۵) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی اڑ لیتی ہیں۔ بطخیں سرد موسم میں قطب شمالی کے سرد علاقوں مثلاً سائبیریا وغیرہ سے اڑ کر گرم علاقوں یعنی جنوب کی طرف نقل مکانی کرتی ہیں۔ بھئی ان کو بھی سردی لگتی ہوگی نا......

بطخ کی آنکھیں اور کان بہت تیز ہوتے ہیں اور یہ دور دور کی چیزیں اور آوازیں بہت آسانی سے دیکھ اور سن لیتی ہے۔ مگر بطخ کی سونگھنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ بطخ کی مخصوص آواز ہوتی ہے جس میں یہ دوسری بطخوں سے بات چیت کرتی ہے۔ بطخ کے گلے میں ایک ابھار ہوتا ہے اور یہ آواز اسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بطخ ہر قسم کے موقع کے لئے الگ آواز نکالتی ہے مثلاً خطرہ ہو تو ایک چیخ نما آواز اور ویسے مختلف آواز۔ جرمنی میں ایک سائنس دان بطخ کی آوازوں پر ریسرچ کر رہا ہے اور وہ ان کی بولی تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہے۔

"بطخ کی چال" بھی کافی مشہور ہے۔ بلکہ بعض انسان بھی جب عجیب طرح چلتے ہیں تو ان کو یہی کہا جاتا ہے کہ دیکھو بطخ کی سی چال چل رہا ہے۔ بطخ ایک تو بہت کم چلتی ہے اور جب چلتی ہے تو نہایت عجیب طریقے سے۔کیونکہ اس کے پیر بہت چھوٹے اور جسم میں پیچھے کی طرف ہوتے ہیں جبکہ بقیہ جسم کافی موٹا ہوتا ہے۔ خشکی پر رہنے والی عام بطخیں جن کے پاؤں ذرا بڑے ہوتے ہیں وہ ہلکا ہلکا دوڑ بھی لیتی ہیں۔ جس طرح کبھی آپ کے پیچھے بھی دوڑی ہوں گی۔ جب بھی کسی جانور کو ستایا جائے تو وہ دفاع تو ضرور کرتا ہے۔ اسی طرح بطخ اپنے دفاع کے لئے دوڑتی ہے، آوازیں نکالتی ہے اور کاٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر چونکہ اس کی چونچ موٹی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی دانت وغیرہ ہوتا ہے لہٰذا وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن بطخیں آپس میں خوب لڑائی کرتی ہیں اور اسٹیمر نامی ایک بطخ تو پانی کے اندر دوسری بطخوں کو ٹانگوں سے کھینچ کر ڈبو بھی دیتی ہے۔

بطخ کی اوسط عمر (۱۵) پندرہ سے بیس سال ہوتی ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹی بطخ اناس نام کی ہے جو صرف دس انچ کی ہوتی ہے۔ جبکہ سب سے بڑی بطخ کی جسامت چوبیس انچ سے بھی زیادہ ہے۔ جنگلی بطخ کا شکار پوری دنیا میں مشہور ہے اور خود ہمارے پاکستان میں کھیلا جاتا ہے۔ پاکستان میں بطخ تمام بڑی جھیلوں اور دریاؤں کے پاس ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ تالابوں، جوہڑوں اور نہروں کے کنارے بھی یہ موجود ہوتی ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں بطخوں کا کافی شکار ہوتا ہے۔ بطخ کو پاکستان سمیت پوری دنیا میں کھایا جاتا ہے۔

مگر پاکستان میں صرف شکاری حضرات ہی بطخ کھاتے ہیں۔ کھانے کے علاوہ بطخوں کے پر تکئے اور بستروں کے گدے بنانے کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور بطخ کارٹون میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ جی ہاں آپ نے ڈونالڈ ڈک (DONALD DUCK) کے کارٹون بھی دیکھے ہوں گے۔ یہ بھی تو ایک بطخ ہے۔ بطخ انسانوں کی طرح ہی تھک بھی جاتی ہے اور سوتی بھی ہے۔ لیکن ان کی نیند چھوٹے چھوٹے وقفوں میں ہوتی ہے جس کے دوران یہ آنکھیں کھولتی اور بند کرتی رہتی ہے۔ سوتے ہوئے بطخ سر کو کندھے کی جانب موڑ لیتی ہے اور چونچ کو ایک طرف کے پر کے نیچے چھپالیتی ہے۔

اس دفعہ آپ پکنک پر کسی جھیل یا دریا کی جانب جائیں تو بطخوں کو ضرور دیکھئے گا اور اگر ہو سکے تو ایک آدھ فوٹو ان کے ساتھ بھی کھنچوا لیجئے گا۔

قرآن پاک غیر مسلموں کی نظر میں

(۱) قرآن پاک کی نظیر سارے جہان میں نہیں ملتی۔ (ڈاکٹر گبن)

(۲) قرآن مجید ایک قانون فطرت ہے۔ (سر ولیم مور)

(۳) قرآن مجید کا مقصد توحید الٰہی ہے۔ (ڈاکٹر مارٹن)

(۴) قرآن مجید سب سے زیادہ قابل احترام ہے۔ (چیمبر انفارمیشن)

(۵) قرآن مجید اپنا ادب خود کرواتا ہے۔ (ڈاکٹر جے ڈبلیو لائنز)

(۶) قرآن مجید سن کر انسان بے اختیار سجدہ میں گر جاتا ہے۔ (جان ریک)

(۷) قرآن مجید اقعی ایک معجزہ ہے۔ (لیونارڈ)

(۸) قرآن مجید عظمت و تقدس کے لحاظ سے یکتا ہے۔ (ٹوف کرپل)

(۹) قرآن مجید ایک وسیع جمہوریہ کا مکمل آئین ہے۔ (جو سورتھ سمتھ)

(۱۰) بے شک قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے۔ (پادری آرمیلو کنگ)

مرسلہ :۔ فوزیہ خانم۔ وعولہ

ڈھال

لبنیٰ اقبال

"گھر میں چھُپ جا۔ ہا ہا ہا باہر نہ نکلنا۔ نہیں تو دھماکہ ہو گا۔ ہاں ...... گولیاں چلیں گی۔ گولیاں۔" اور اس کے ساتھ ہی بوڑھی پاگل عورت دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر اچانک وہ پاس کھڑے سعادت کے پیچھے بھاگنے لگی۔

"چل! گھر بھاگ جا ورنہ میں بہت ماروں گی۔" باقی بچے تو ڈر کے اِدھر اُدھر ہو گئے مگر سعادت اس بیچاری بوڑھی عورت کو دیکھ رہا تھا جو کبھی سعادت کے گھر کے قریب ہی رہا کرتی تھی وہ بیوہ تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو سعادت ہی کا ہم عمر تھا۔ سعادت کی اس بچے کے ساتھ بہت زیادہ دوستی تو نہ تھی البتہ وہ کبھی کبھار اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بوڑھی عورت کو لوگ "خالہ آمنہ" کہا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کے گھر برتن وغیرہ مانجھنے کا کام کرتی تھی اور اپنے بچے کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتی تھی۔ مگر افسوس! ہوا وہی تھا جو آئے روز ہو رہا ہے اور "خفیہ ہاتھ" کو نہ پکڑنے تک ہوتا رہے گا ....

خالہ آمنہ اپنے بیٹے کے ساتھ سڑک سے گذر رہی تھی کہ دہشت گردوں نے کار کے ذریعے

فائرنگ شروع کر دی۔ جس سے بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور خالہ آمنہ نے خوفزدہ ہو کر اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا جیسے اب وہ محفوظ ہو گیا ہو۔ مگر خالہ آمنہ کا بیٹا ڈھال بن گیا اور اس نے خود گولی کھا کر ماں کو محفوظ کر دیا۔ خالہ کے بیٹے نے وہیں خالہ کے ہاتھوں میں ہی دم توڑ دیا۔ اور تب سے خالہ آمنہ دیوانوں کی طرح بازاروں میں پھرتی رہتی اور بچوں کو گھروں میں چھپ جانے کو کہتی ....

سعادت کو جب پتہ چلا کہ خالہ آمنہ کے بیٹے کو گولی لگی اور وہ مر گیا تو اس نے حیرانی سے سوچا کہ اس غریب کی کسی سے کیا دشمنی تھی۔ وہ تو کبھی بچوں سے بھی نہیں لڑتا تھا۔ وہ تو بہت نیک تھا۔ پھر اسے کیوں مار دیا گیا؟

سعادت کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ پھلوں کی ریڑھی لگاتا تھا۔ چھ بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑا تھا۔ ان کے مالی حالات اتنے اچھے نہ تھے کہ وہ اسکول جاتا۔ وہ ایک ورکشاپ میں "چھوٹے" کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ورکشاپ کا مالک ایک بہت سخت مزاج آدمی تھا۔ اور ورکشاپ میں کام کرنے والے لوگوں کی غلطی کبھی معاف نہیں کیا کرتا تھا بلکہ فوراً اسے باہر نکال دیتا تھا۔ سعادت کا دل اسکول جانے اور پڑھنے کو کرتا تھا مگر اپنے باپ کی طرح وہ بھی بے بس تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اسے سڑک پر پڑی ہوئی ایک پھٹی پرانی کتاب ملی۔ اور وہ احتیاط سے اسے اٹھا کر ورکشاپ لے آیا تھا۔ اور استاد کی آنکھ بچا کر اسے الٹ پلٹ کر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے آکر اسے زوردار ٹھوکر ماری۔

کام چور، ہڈ حرام، کام سے جی چراتا ہے اور پھر جب اس کی نظر کتاب پر پڑی تو گویا اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"اپنی اوقات یاد رکھ" اس نے ایک تھپڑ اور جڑتے ہوئے کہا۔ "یہ تم جیسے لوگوں کے چونچلے نہیں سمجھے؟" تب سے سعادت نے کتاب پڑھنے سے توبہ کر لی تھی۔

اسے ورکشاپ میں کام جو کرنا تھا۔ سعادت بہت ذہین اور حساس بچہ تھا۔ وہ ورکشاپ میں آنے والے "صاحب ٹائپ" لوگوں کی باتیں بڑے غور سے سنتا۔ جو کبھی سیاست یا ملکی حالات پر تبصرہ کر رہے ہوتے۔ مگر سعادت کو کبھی سمجھ نہیں آتا کہ بازاروں میں بم کیوں رکھ دیئے جاتے ہیں؟ جب بہت سے لوگ ان دھماکوں سے مر جاتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو دکھ نہ ہوتا ہو گا۔ اور پولیس ان لوگوں کو جو دھماکے کرتے ہیں پکڑتی کیوں نہیں۔

مگر دن گذرتے رہے اور حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہ آسکی۔ نہ سعادت کے گھریلو حالات میں اور نہ ملکی حالات میں۔

ایک دن سعادت نے خبر سنی کہ پولیس شہر میں بدامنی اور دہشت گردی پھیلنے والے مشتبہ افراد کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے اور انہیں پکڑ رہی ہے۔سعادت نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر سب ٹھیک نہ ہوا۔

جب سعادت کو پتہ چلا کہ ان مشتبہ افراد میں پولیس اس کے باپ کو بھی پکڑ کر لے گئی ہے تب پہلی بار سعادت جی بھر کے رویا۔ وہ نہ تو اپنے باپ کے لئے کچھ کر سکتا تھا اور نہ اپنے لوگوں اپنے ملک کے لئے، کیونکہ وہ ایک ان پڑھ، غریب ورکشاپ میں کام کرنے والا "چھوٹا" تھا۔ جو دوسرے لوگوں کی نظر میں بہت ہی "چھوٹا" ہوتا ہے۔ سعادت کا باپ تین دن حوالات میں رہا۔ اور بالآخر اسے چھوڑ دیا گیا۔

سعادت کے دن پھر ویسے ہی گذرنے لگے۔ روز کام، جھڑکیاں اور کبھی کبھار مار بھی کھانا اور شام کو گھر آکر سو رہنا۔

ایک دن سعادت ورکشاپ میں کام کر رہا تھا کہ بازار میں یک دم بھگدڑ مچ گئی۔ اور لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ چند شرپسند موٹر سائیکلوں پر فائرنگ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔

اسی اثناء میں دو موٹر سائیکل سوار جنہوں نے چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ سعادت کو دور سے نظر آئے۔

سعادت کے ہاتھ میں لوہے کا کام کرنے والا وزنی ہتھوڑا تھا۔ جسے وہ کام کرتے ہوئے بے خیالی میں ابھی تک پکڑے ہوئے تھے۔ نشانہ تو اس کا بہت اچھا تھا اور سعادت کو اپنے نشانے پر پورا اعتماد بھی تھا۔ پھر اس نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

جونہی موٹر سائیکل سوار اس کے تھوڑا قریب آئے۔ اس نے نشانہ لے کر ہتھوڑا ایک سوار کے سر پر کھینچ مارا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور وہ سوار آن کی آن میں سڑک پر آرہا۔ ابھی سعادت خوش بھی نہ ہو سکا تھا کہ ایک گولی سیدھے اس کے سینے میں آکر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لوگوں نے زخمی نقاب پوش کو پکڑ کر قابو کر لیا۔

مگر کسی کا دھیان زخمی سعادت کی طرف نہ جا سکا۔ جو بے ہوش ہو چکا تھا۔

بے ہوش سعادت کو سب سے پہلے "آمنہ خالہ" نے دیکھا۔ وہ چیخیں مارنے لگی۔ "تم نے پھر میرے بیٹے کو مار دیا۔"

مگر سعادت ان آوازوں کی حد سے دور جا چکا تھا۔ لیکن اپنے بہت سے لوگوں کے لئے ایک ڈھال بن گیا تھا۔

غزل پزل

اُسامہ بن سلیم

آخری مقابلہ

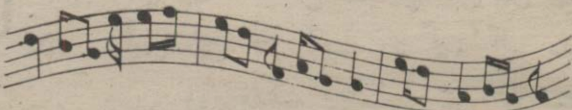

معلومات اور ذہانت کا منفرد ماہانہ مقابلہ

غزل پزل کا آخری مقابلہ حاضر ہے۔ غزل پزل میں جب تک آپ کی دلچسپی برقرار رہی ہم نے بھی اسے برقرار رکھا۔ اب جب کہ ساتھیوں نے کسی نئے انداز کے مقابلے کی فرمائش شروع کر دی ہے، ہم اس سلسلے کو ختم کر رہے ہیں۔ سال نو کے آغاز پر شائع ہونے والے "اطفال نمبر" میں۔ ہم انشاء اللہ معلومات عامہ کے کسی نئے انداز کا اعلان لے کر حاضر ہوں گے۔

آپ گواہ رہئے کہ ہم نے کبھی بھی کوئز کے روایتی اور فرسودہ طریقوں کو متعارف نہیں کروایا بلکہ ہر ممکن کوشش کی کہ نت نئے معموں اور مقابلوں سے آپ کی دلچسپی کو برقرار رکھا جائے۔ آئندہ ہم کیا پیش کرنے جا رہے ہیں، یہ کہنا قبل از وقت ہوگا اس سلسلے میں اگر آپ بھی کوئی اچھوتا خیال پیش کرنا چاہیں تو ہم آپ کو بھی خوش آمدید کہیں گے۔

لیجئے نیا مقابلہ حاضر ہے۔ اسکیچز اور علامتوں کو اشعار کی مدد سے پہچانئے اور کوپن پر اپنے جواب لکھ کر ۱۵ دسمبر سے قبل ہمیں بھجوا دیجئے۔ کوپن آخری صفحات میں موجود ہے۔ تین ساتھیوں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ بہترین انعامات کی پیش کش برقرار رہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے۔ ممکن ہے کہیں انعام پر آپ کا نام بھی لکھا ہو۔ ورنہ درست جواب پانے والوں کی فہرست میں آپ کے نام کی اشاعت، آپ کی ذہانت اور علمیت کا اعتراف تو ہے ہی۔

(مرتب)

۱۔ اللہ کا بندہ ہے، اُس کا ایک سوالی ہے
بت شکنی سے نسبت ہے، یہ نسبت عالی ہے
۲۔ دنیا کے چپے چپے میں اس کا جال بچھا ہے
مکتب مکتب اس نے کتنی شہرت پالی ہے
۳۔ اس کو کھیلنا چاہیں بھی تو ہم نہ کھیل سکیں
برفانی ملکوں کی کیسی گیم نرالی ہے
۴۔ بھینسا ہے نہ بیل کوئی، نہ ہاتھی گینڈا ہے
کون ہے آخر جس نے ایسی شکل بنالی ہے
۵۔ جنگوں میں کام آنے والا کیسا آلہ ہے
دیبل کی ہر بلڈنگ کس نے پل میں ڈھالی ہے
۶۔ اک نغمہ دانائی کا جو اس کے دم سے ہے
ایک گلستاں شعروں کا یہ اس کا مالی ہے
۷۔ یہ نہ ہو تو کٹ جائیں ہم باقی دنیا سے
سائنس کی دنیا میں اس کا نام مثالی ہے
۸۔ سین سمندر دنیا کی یہ عجب سی ہے مخلوق
دیکھ کے اس کو یوں لگتا ہے، ڈسنے والی ہے
۹۔ ایک علامت ایسی جس کو دیکھ کے ہم ڈر جائیں
اس کا مطلب جو نہ سمجھے، ذہناً خالی ہے
۱۰۔ لوٹ کھسوٹ تھا پیشہ جن کا بن بیٹھے سردار
اک پنجاب کے حاکم نے کیا شہرت پالی ہے

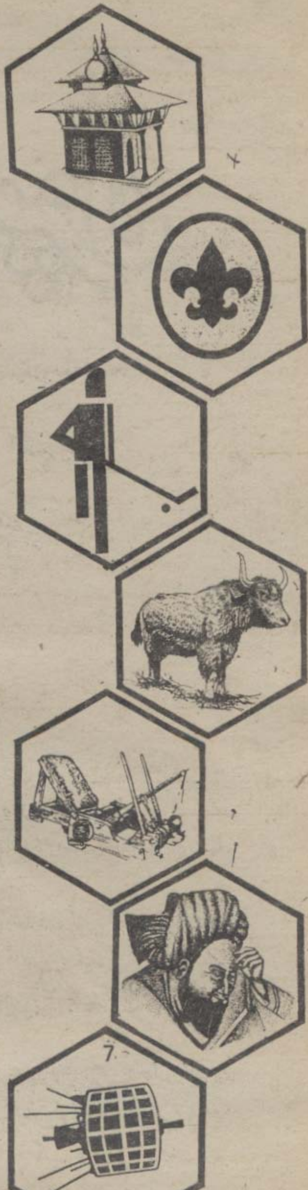

گزشتہ ماہ کے درست جوابات

(۱)...... سقراط۔(۲)...... میوزک نوڈ۔(۳)...... ڈیوڈ اسٹار۔ (داؤدی ستارہ)(۴)...... یونیسیف۔(۵)...... سکندر اعظم۔(۶)...... سعودی ایرلائنز۔(۷)...... صلیب کا نشان(۸)...... بیر بہوٹی۔(۹)...... بادبانی کشتی۔ (۱۰)...... بیس بال۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱)...... ثوبیہ نثار۔ گلشن اقبال۔ کراچی(۲)...... سیّد عارف رضا۔ لطیف آباد حیدر آباد(۳)...... محمد عمران قادر۔ ٹنڈو آدم۔

صحیح جوابات بھجوانے والے ساتھیوں کے نام

(۱) سمیرا نعیم۔ کراچی۔ (۲) ثوبیہ نثار۔ کراچی۔ (۳) شائلہ آفتاب خان۔ حیدر آباد۔ (۴) اطہر رضا کراچی۔ (۵) عدنان احمد صدیقی۔ کراچی۔ (۶) شہلا یوسف۔ کراچی۔ (۷) دانش جاوید۔ کراچی۔ (۸) شازیہ ناز۔ کراچی۔ (۹) ارسلان ظہیر۔ حیدر آباد۔ (۱۰) عامر زیدی۔ حیدر آباد۔ (۱۱) قرۃ العین رحمت۔ بہاولپور۔ (۱۲) فیصل انوار۔ کراچی۔ (۱۳) نیر آفاق کراچی (۱۴) داؤ یاور خان۔ حیدر آباد۔ (۱۵) اکبر علی ذیشان۔ کراچی۔ (۱۶) عمارہ انجم۔ لاہور۔ (۱۷) کامران خان۔ کراچی۔ (۱۸) سید آصف رضا زیدی۔ حیدر آباد۔ (۱۹) سید یوسف نصراللہ۔ کراچی۔ (۲۰) شاہ رخ محمد۔ کراچی۔ (۲۱) اطہر علی ظفر۔ کراچی۔ (۲۲) افروز یوسف۔ کراچی۔ (۲۳) ناجیہ قریشی۔ کراچی۔ (۲۴) قرۃ العین۔ کراچی۔ (۲۵) فیصل احمد خان۔ کراچی۔ (۲۶) عاصم حسین خان۔ ٹنڈو الہ یار۔ (۲۷) عالم خان، پشاور (۲۸) ثوبیہ طلعت۔ کراچی۔ (۲۹) زہرا خالد۔ لاہور۔ (۳۰) آنسہ ثوبیہ ریاض۔ راولپنڈی۔ (۳۱) ثوبان صدیقی۔ راولپنڈی۔ (۳۲) سیدہ کرن رضوی۔ کراچی (۳۳) سبطین خان۔ ایبٹ آباد (۳۴) برکات احمد۔ سرگودھا (۳۵) محمد ریحان شیخ۔ کراچی (۳۶) سلمان محمود۔ کراچی (۳۷) نادیہ کمال۔ کراچی

وضاحت

گزشتہ ماہ کے مقابلے میں پہلا سوال ہم نے سقراط سے متعلق پوچھنا چاہا تھا شعر میں اشارہ بھی سقراط ہی سے متعلق تھا مگر سہواً سقراط کی جگہ افلاطون کی تصویر شائع ہوگئی۔ اس غلطی پر مرتب معذرت خواہ ہے۔ جن ساتھیوں نے سقراط یا افلاطون لکھا ہے۔ ، ان دونوں کے جواب درست مان لئے گئے ہیں۔ آپ اپنی معلومات کے لئے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ گزشتہ ماہ کی تصویر افلاطون کی تھی، جب کہ زہر کا پیالہ سقراط نے پیا تھا۔ (مرتب)

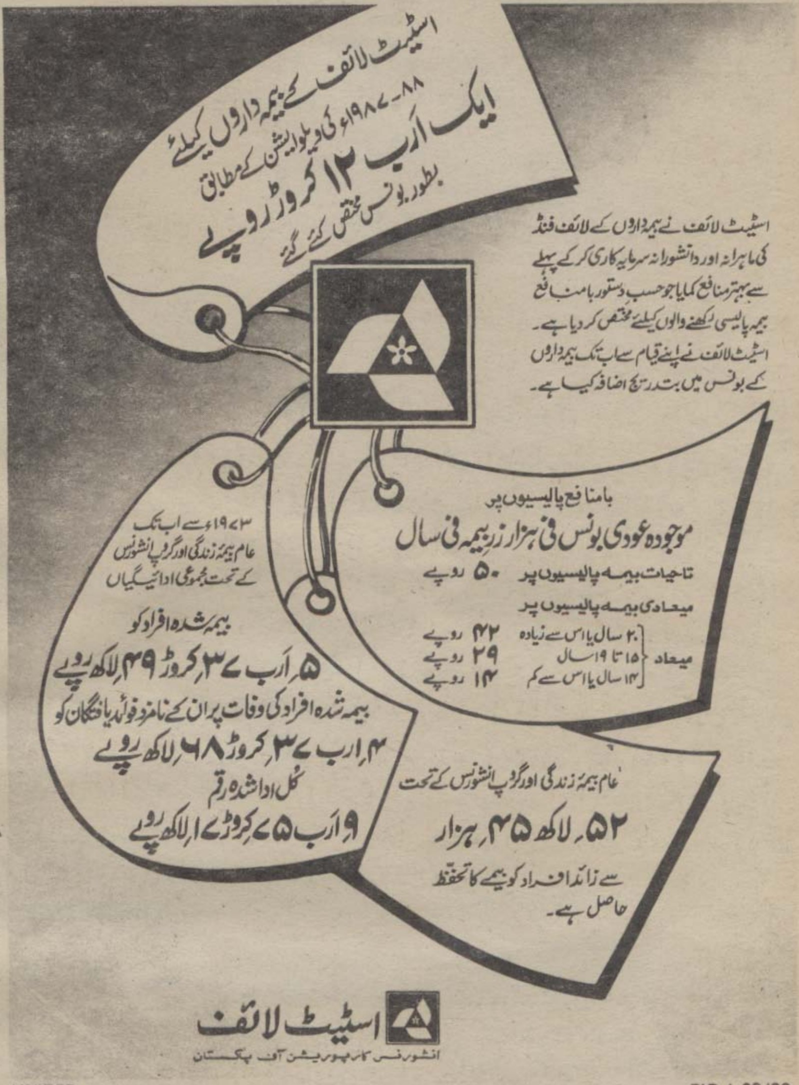

UNITED PID-1-29/90

۲۵۰ تحائف مفت حاصل کیجئے

موتی جیسے دانت خوشبو جیسی سانس

یہ تو اُسی وقت ممکن ہے جب آپ باقاعدگی
سے دانت صاف کرتے ہوں

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھی دانتوں کی صفائی
کی اہمیت سے کس قدر آگاہ ہیں؟

ہماری مدد کیجئے۔

زیر نظر کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم ۲۵۰ منتخب دوستوں کو
(قرعہ اندازی کے ذریعہ) حسین تحائف بھجوانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

نام .... عمر ....

پتہ ....

شہر و ضلع ....

سوالنامہ

سوالنامہ پُر کر کے آپ ہمیں جلد از جلد ماہنامہ آنکھ مچولی کے پتے پر بھجوا دیجئے۔

(آپ کا جو بھی جواب ہو اُس پر ✓ کا نشان لگا دیں)

۱...... آپ دن میں کتنی بار اور کن اوقات میں دانت صاف کرتے ہیں۔ ؟

○ - ہر کھانے کے بعد۔ ○ - رات سونے سے پہلے اور ناشتے کے بعد۔

○ - صبح ناشتے سے قبل۔

۲...... آپ دانتوں کی صفائی کے لئے کیا استعمال کرتے ہیں۔ ؟

○ - ٹوتھ پیسٹ۔ ○ - پاؤڈر۔ ○ - منجن۔ ○ - مسواک۔

۳...... آج کل آپ کے زیر استعمال کون سا ٹوتھ پیسٹ / پاؤڈر یا منجن ہے۔ ؟

نام لکھیے۔

۴...... آپ کون سا ٹوتھ برش استعمال کرتے ہیں۔ ؟ نہیں کرتے۔

نام لکھیے

۵...... اس سے قبل آپ دانت کس چیز سے صاف کرتے تھے۔ ؟

ٹوتھ پیسٹ، پاؤڈر، منجن یا جو کچھ بھی اسکا برانڈ ہو لکھیے

۶...... موجودہ زیرِ استعمال ٹوتھ پیسٹ / منجن / پاؤڈر سے آپ کس طرح متعارف ہوئے۔ ؟ ٹی وی اشتہار اخبار یا ریڈیو.. کوئی دوست... محض اتفاقیہ.........

۷...... آپ کو آج کل زیر استعمال ٹوتھ پیسٹ / پاؤڈر یا منجن کیوں پسند ہے۔ ؟

قیمت... خوبصورتی... ذائقہ... خوشبو.. تحفہ... کچھ اور؟

۸...... آپ ایک ہی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں یا بدل بدل کر۔ ؟

ایک ہی....... بدل بدل کر۔

پتہ: آنکھ مچولی "جائزہ صحت"۔ ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۷

میری پہلی تحریر

عہد

رضوان شیخ ...... فیصل آباد

چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اور میرے دوست ندیم نے سیر و تفریح کے لئے گاؤں میں جانے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ ہفتے کے دن ہم تیار ہو کر جانے والے ہی تھے کہ ہماری کرکٹ ٹیم کا

کپتان عامر آگیا اس نے بتایا کہ بدھ کو وکٹری کرکٹ کلب سے شام پانچ بجے میچ ہے لہٰذا تم دونوں بدھ کی شام پانچ بجے سٹی مسلم ہائی اسکول کے گراؤنڈ میں پہنچ جانا۔ ہم تم دونوں کا انتظار کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پھر ہم بس اسٹاپ پر پہنچ گئے کچھ دیر بعد بس چل پڑی ٹھیک دو گھنٹے بعد ہم گاؤں پہنچ گئے۔

خوب سیر و تفریح کے بعد بدھ کے روز دو بجے تیار ہو کر ہم بس اسٹاپ کی طرف آگئے وہاں آکر پتہ چلا کہ پہلی بس نکل چکی ہے اور دوسری بس کو ۳ بجے جانا ہے جبکہ میچ پانچ بجے شروع ہو جانا تھا۔

ہمارے گاؤں سے فیصل آباد تک کا سفر دو گھنٹے کا ہے۔ یہ سوچ کہ ہم اداس ہو گئے کہ شاید یہ میچ ہم نہ کھیل سکیں، اتنے میں ایک ٹریکٹر ٹرالی آگئی جس میں چند آدمی سوار تھے، ہم یہ دیکھ کر خوش ہو گئے کہ اس میں سوار ہو کر وقت پر فیصل

آباد پہنچ جائیں گے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز سنائی دی۔ اذان کی آواز سنتے ہی میرے دوست ندیم نے کہا کہ چلو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے بے فکری سے کہا "یار فیصل آباد جاکر پڑھ لیں گے کیونکہ یہ ٹرالی جارہی ہے" لیکن وہ نہ مانا پھر ہم مسجد چلے گئے۔ جب نماز پڑھ کہ واپس آئے تو ٹرالی جاچکی تھی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد بس آگئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ راستے میں ایک برساتی نالہ پڑتا ہے، جس پر پل نہیں بناہوا اس طرف سے گزرتے وقت خطرناک موڑ آتے ہیں جب ہماری بس وہاں پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ وہی ٹرالی اس برساتی نالہ میں الٹی ہوئی ہے اور تمام آدمی ہلاک ہو چکے تھے یہ دیکھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر ہم نماز کے لئے نہ رکتے اور اس ٹرالی میں سوار ہو جاتے تو.......... لیکن اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا......

البتہ اسی وقت میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی نماز قضا نہیں کروں گا۔

وطن کا سپاہی

افشین اسد۔ کراچی۔

"باجی" ! غسل خانہ سے نکلتے ہوئے حامد نے زور سے آواز دی۔ "جلدی کیجئے ۸ بج چکے ہیں، نو بجے تک مجھے پہنچنا ہے۔

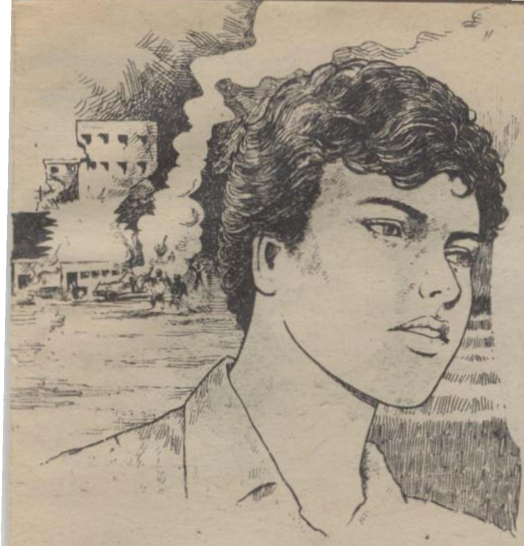

"دیر تو تم خود کر رہے ہو۔ ناشتہ تیار ہے......" باجی نے دستر خوان بچھاتے ہوئے کہا۔

بھیا میں نے جوتوں پر پالش کر دی ہے۔ رعنا جوتے اٹھائے ہوئے حامد کے پاس آئی۔

"واہ میری گڑیا" مجھے نوکری تو ملنے دو..... تیرے لئے بہت سے کھلونے لاؤں گا۔ حامد نے ہلکا سا چپت لگایا۔ رعنا ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

آج وہ سب لوگ بہت خوش تھے۔ طویل محنت اور جدوجہد کے بعد حامد کے مرحوم والد اور والدہ کی تمنا پوری ہوئی تھی۔ حامد کی خود بھی یہ ہی خواہش تھی کہ وہ اپنے مرحوم باپ کی طرح فوج میں ملازمت کر کے ملک و قوم کی خدمت کرے۔ آج اس کا آخری ٹیسٹ تھا۔ اسے اپنے خدا سے قوی امید تھی کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔ حامد کی ماں دیر سے جائے نماز پر بیٹھی اپنے بیٹے کی کامیابی کے لئے خدا کے حضور گڑگڑا رہی تھیں۔ حامد تیار ہو کر اپنی امی

کے سامنے جا بیٹھا۔

"امی جان...... دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے کامیاب کرے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظر دیوار پر لٹکی ہوئی والد کی تصویر پر گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کاش ابّو زندہ ہوتے تو دیکھتے ان کا بیٹا آخر اپنی منزل کے کتنے قریب پہنچ گیا ہے۔ ان کا خواب پورا ہو رہا ہے۔ ماں نے اس پر دعا کر کے دم کیا۔ "جاؤ بیٹا۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" حامد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا

"حامد لو یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ واپس آتے ہوئے مٹھائی ضرور لیتے آنا مسنیاز کے لئے۔" باجی نے بھی حامد کو دعا دی......

حامد جاتے ہوئے راستے میں سوچ رہا تھا۔ جب مجھے ملازمت مل جائے گی تو میں اپنی ماں کو ہر کام سے آزاد کر دوں گا۔ کتنی محنت کرتی ہے وہ بچپن سے دیکھ رہا تھا کہ ابّو کے انتقال کے بعد سے آج تک انہیں اس قابل بنانے کے لئے دن رات کس قدر محنت کی ہے۔ اور اُن سب کو باپ کے نہ ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ خدا بھی کبھی اپنے نیک اور محنتی بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ حامد سلیکٹ کر لیا گیا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ وہ یہ خوشخبری اپنی امی اور باجی کو سنانا چاہتا تھا۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ وہ تیزی سے بس اسٹاپ پر آیا مٹھائی کی دوکان سے نیاز کے لئے مٹھائی خریدی اور بس کا انتظار کرنے لگا

"بس کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔" وہ ٹہلتے ہوئے بڑبڑانے لگا...... دور سے آتی ہوئی بس دیکھ کر وہ آگے بڑھا۔ مگر اس سے پہلے ایک سفید رنگ کی کار آ کر رکی اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے پریشان حال لوگوں پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ ان چند لمحوں میں وہاں موجود کئی جوان، بچے اور بوڑھے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ کار چلی گئی۔ مگر بس اسٹاپ پر مرنے والوں زخمیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی

مرنے والوں میں وہ ہمت و جرأت کا مالک حامد بھی شامل تھا۔ جو کمیشن ملتے ہی اپنے وطن پر قربان ہو گیا۔

وہ اپنے سلیکشن کی خوشخبری بھی اپنی ماں اور بہن کو نہ سنا سکا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا مگر مٹھائی کا وہ ڈبہ جو اس نے اپنی کامیابی پر گھر والوں کے لئے خریدا تھا۔ اب اس کی فتح کا شاہد تھا۔

ہم نے آم کھائے

عبدالبصیر چغتائی، ڈیرہ غازی خان

میں، احمد اور عمیر اسکول سے واپس آرہے تھے۔

ٹھہرئیے پہلے میں آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب ہم چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہم نے ایک گروہ بنا رکھا تھا۔ اس

گروہ کا مقصد اسکول ٹائم کے بعد لوگوں کو اپنی شرارتوں سے تنگ کرنا تھا۔ مگر اس واقعے کے بعد (جو میں آپ کو آگے چل کر سناؤں گا۔) ہم نے شرارتوں سے توبہ کر لی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک دن ہم اسکول سے واپس آ رہے تھے اور کوئی نئی شرارت سوچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مجھے ایک کوٹھی میں آموں کے درخت نظر آئے۔ پھر ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ اور مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے اپنی شرارت سے احمد اور عمیر کو آگاہ کیا تو دونوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ہم نے کوٹھی کی دیوار کے ساتھ اپنے بستے رکھے۔ اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ میرے کندھے پر چڑھ کر احمد دیوار پھلانگ گیا۔ اسی طرح عمیر نے بھی دیوار عبور کی۔ آخر میں، میں رہ گیا۔ میں نے دیوار پر چڑھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر کسی طرح میں بھی دیوار پر چڑھ کر اسے پھلانگ گیا۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب وہاں کوئی نظر نہ آیا تو ہم نے آم کے ایک درخت پر چڑھنا شروع کیا اور پھر درخت پر بیٹھ کر ہم آم کھانے لگے۔ درخت پر صرف میں اور احمد چڑھے تھے اور عمیر کو چوکیداری کے لئے نیچے ٹھہرا دیا تھا۔ اور اسے ہدایت کی تھی کہ جب کوئی خطرہ ہو تو ہمیں آگاہ کر دے۔ مگر عمیر ڈرپوک نکلا ہم آم کھاتے رہے۔ اور جب ہمارا پیٹ بھر گیا تو ہم نے اپنی قمیص کی جیبیں آموں سے بھرلیں۔ پھر ہم نیچے اترنے لگے ابھی ہم پوری طرح اترے بھی نہ تھے کہ ہمیں مالی کی آواز سنائی دی (جو بالکل قریب سے آئی تھی) ایک تو ہم مالی کی وجہ سے پریشان تھے اور جب ہم نے عمیر کو دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا تو ہمیں بڑا غصہ آیا۔ اور ہم دل ہی دل میں عمیر کو کوسنے لگے کہ اس نے ہمیں نہیں بتایا کہ مالی آ رہا ہے۔

ادھر ہم عمیر کو کوس رہے تھے کہ مالی کا ڈنڈا فضا میں بلند ہو کر نیچے گرا اور میرے سر پر لگا۔ اس اچانک آفت سے میں سنبھل نہ سکا اور سیدھا نیچے آ رہا۔ یہی حال احمد کے ساتھ ہوا۔ مالی ہم کو پیٹے جا رہا تھا اور ہم درد سے بلبلا رہے تھے۔ عین اسی وقت ایک شخص کمرے سے نکلا اور چیخ مار کر بولا۔ "یہ کیا شور ہے؟" ہم یہ آواز سن کر نیچے گر پڑے اور ہمارے اعصاب جواب دے گئے۔ دراصل یہ آواز ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی تھی۔ جب انھیں مالی نے ساری بات بتائی تو انھیں ہم پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن اپنے اوپر ضبط کرتے ہوئے انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ ایسی حرکت کرنا اچھی بات نہیں۔ اور پھر انھوں نے ہم دونوں کو چار چار آم دیئے۔

اب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی کوٹھی ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہم نے ہمیشہ کے لئے شرارتوں سے توبہ کر لی۔

دنیا بھر میں آزمودہ
نیا
FRESHMINT
FLUORIDE
macleans
UNIQUE FORMULA for healthy teeth AND GUMS
پلاک دور
PLAQUE FIGHTING
PA1
پلاک کیا ہے؟
پلاک جراثیم کی چکنی تہہ ہے جو دانتوں کی سطح پر جم جاتی ہے۔ اگر اس کو دور نہ کریں تو اس کی وجہ سے دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے۔ پلاک مسوڑوں کی بیماری کا سبب ہے جس سے دانت گر جاتے ہیں۔
نیا میکلینز۔ پلاک سے حفاظت کے لیے دنیا بھر میں آزمودہ۔
میکلینز نے مسوڑوں کی صحت کے لیے اپنے فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹ کے نئے منفرد فارمولے میں PA1 کا اضافہ کیا ہے۔ یہ خصوصی جراثیم کش جزو کلینیکل تجربات میں پلاک سے بچاؤ کے لیے آزمایا ہوا ہے، اور فلورائیڈ کیڑے سے حفاظت کے لیے مؤثر ہے۔
MILDMINT
macleans
FRESHMINT
macleans
پلاک دور۔
دانت مضبوط
ASIATIC

سنا ہے پھول برستے ہیں مسکرانے سے

مسکراہٹ ہمارے چہرے کا حسن بھی ہے اور ہماری باطنی خوشی کا اظہار بھی۔
بچے مسکرائیں تو دلوں کو سرور اور ذہنوں کو آسودگی ملتی ہے۔

کیا آپ کو دعویٰ ہے کہ

آپ، آپ کا بھائی بہن یا کوئی بھی عزیز بچہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگتا ہے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ

آپ کی خوشگوار مسکراہٹ کی راہ میں گندے دانت، حائل نہیں ہیں

اگر ایسا ہے تو پھر مسکرائیے

مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت رنگین تصویر ہمیں بھجوا دیجئے آپ کے موتی دانتوں کے ساتھ۔ آپ کی جگمگاتی مسکراہٹ پر ایک خوبصورت ہنستی مسکراتی **شیلڈ** SMILING SHEILD اور بہت سے تحائف آپ کے منتظر ہیں

شرکت کی آخری تاریخ ۱۵ دسمبر ۹۰ء عمر کی حد تین سے ۱۳ سال ہے۔
غیر واضح تصویر مقابلے میں شامل نہ ہو سکے گی۔ تصویر کا پوسٹ کارڈ سائز ہونا ضروری ہے۔
تمام منتخب اور انعام یافتہ تصاویر جنوری ۱۹۹۱ء کے خاص نمبر میں شائع ہوں.

مقابلۂ مسکراہٹ کے نتائج کے لیے جیوری درج ذیل اداروں کے نامزد کردہ نمائندوں پر مشتمل ہوگی

۱ کرسٹل ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، انفورڈز پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۲ اسپارکل ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، ٹرانسپاک (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳ سگنل 2 ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، لیور برادرز پاکستان لمیٹڈ
۴ کالگیٹ ٹوتھ پیسٹ بنانے والے، کالگیٹ پامولو (پاکستان) لمیٹڈ

صائمہ حنیف

چھوٹی دادی جان

دبلا پتلا تنکے جیسا جسم، منہ میں نقلی بتیسی، قد عالم چنا سے بس مٹھی بھر کم موٹے فریم کا چشمہ، منہ میں پان کا بڑا سا بیڑا، سفید کرتا، آڑا پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی کانوں میں سونے کی بالیاں، گلے میں سچے موتیوں کی مالا اور چاندی کی چھوٹی سی تلوار (خلال) یہ حلیہ ہے ہماری چھوٹی دادی جان کا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد ہم گھر میں داخل ہوئے اور چاہتے تھے کہ سیدھے اپنے کمرے میں جاکر اسکول یونیفارم تبدیل کریں کہ اچانک ہمیں ڈرائنگ روم میں سے کسی کے رونے کی آواز آئی ہم نے گھبرا کر فوراً ڈرائنگ روم کا رخ کیا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو محترم خاتون جن کا اوپر تعارف کیا جاچکا ہے کسی بات پر قہقہہ لگارہی تھیں۔

ہمیں اپنی قوت سماعت پر شک گزرا، ابھی ہم حیرانی و پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے کہ اگلے ہی لمحے ہماری دادی جان نے ہم کو اپنے پاس بلایا اور ان محترمہ سے ہمارا تعارف کرایا کہ "بیٹی یہ آپ کی چھوٹی دادی جان ہیں۔ پہلی مرتبہ انڈیا سے پاکستان آئی ہیں۔ آپ کے ابو کی خالہ اور آپ کی دادی جان کی چھوٹی بہن ہیں۔"

چھوٹی دادی جان نے کہا کہ "ماشاء اللہ بڑی اچھی بچی ہے" اور ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ بیٹھیں "کون سی کلاس میں پڑھتی ہو بیٹی؟"

یہی ایک سوال ہے جس کا صحیح جواب دیتے ہمیں شرم آتی ہے۔ چھوٹی دادی کو بھی ہم نے اپنے قد اور جسامت کے لحاظ سے اپنی کلاس بتائی جس کو سن کر چھوٹی دادی جان نے ہمیں مزید اپنی دعاؤں سے نوازا لیکن ہماری امی اور دادی جان ہمارے اس سفید جھوٹ پر بس ہمیں حیرت سے دیکھتی رہیں امی جان نے ہمیں حکم دیا "جاؤ کپڑے بدلو اور بُوا سے کہو کھانا لگا دے اتنی دیر میں اور بچے بھی آتے ہی ہوں گے۔"

دوپہر کو کھانے کی میز پر تمام گھر والوں سے چھوٹی دادی کا تعارف ہوا۔ ہماری باجی نے امی جان کو بتایا کہ امی جان کل سے میرے سمسٹر شروع ہو رہے ہیں (یہ باجی کی ایک چال ہے جو ہم اچھی طرح جانتے ہیں) اور یوں وہ تو چھوٹی دادی کی خدمت سے بچ نکلیں اب سارے نادر شاہی احکامات میرے سر تھے اس جانِ ناتواں کے کمزور شانوں پر ان کی خدمت کی بھاری ذمہ داریاں بھی پڑ چکی تھیں۔

ادھر ہم روزانہ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد قیلولہ فرماتے ہیں بلکہ اس بہانے سے چار پانچ گھنٹے سو لیتے ہیں۔ ہمیں ابھی سوئے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہو گا (یہ ہمارا خیال ہے) کہ چھوٹی دادی کی آواز سنائی دی، چھوٹی دادی کی آواز پر توجہ دی تو معلوم ہوا وہ ہمیں پکار رہی تھیں۔

"صائمہ، " اری صائمہ، "او صائمہ کی بچی" اے میری پوتی صائمہ۔" لگاتار غیر ضروری جملوں کے بعد یہ پیار بھرا حقیقی جملہ سن کر اٹھ ہی گئے۔ اور چھوٹی دادی جان کی خدمت میں آداب بجا لائے۔

ہماری قابلِ رحم صورت دیکھنے کے باوجود چھوٹی دادی جان ہم پر برس پڑیں "اری میں کہوں ایک نہیں دو نہیں تین نہیں گن کر چار آوازیں دیں سنی کیوں نہیں؟" ہم نے معصوم سی شکل بنا کر جواب دیا "دادی جان پہلے آپ نے کسی صائمہ کو بلایا، پھر کسی اری صائمہ کو جو یہاں تو کیا ہمارے محلے میں بھی نہیں رہتی اس کے بعد آپ نے کسی صائمہ کی صاحب زادی کو آواز دی اور آخر میں آپ نے اپنی پوتی کو بلایا سو میں حاضر ہوں۔" اس جواب کو سن کر چھوٹی دادی جان گھبرا گئیں اور بولیں "اچھا چل معاف کیا۔"

یہ سن کر میں واپس جانے کے لئے مڑی کہ وہ دوبارہ چلائیں "اری کہاں چلی" کہیں نہیں دادی جان ہم نے مختصر سا جواب دیا۔

کہنے لگیں۔ "ٹی وی پروگرام کب شروع ہو گا؟" یہ سوال سن کر ہم تو بڑے سٹ پٹائے، ایک یہ انڈین دادی ہیں اور ایک ہماری پاکستانی دادی جان ہیں کہ جب تک ٹی وی چلتا رہتا۔ وہ ٹی وی والے

کمرے میں داخل ہی نہیں ہوتیں۔ میں نے چھوٹی دادی جان کو جواب دیا "ابھی ٹی وی شروع ہونے میں ڈھائی گھنٹے باقی ہیں۔"

بولیں "تیرا بھائی ذاکر کہاں ہے؟"

میں نے بتایا کہ "ذاکر ہوم ورک کر رہا ہے کیوں بلا لاؤں کیا؟"

"نہیں نہیں بس اس سے یہ پوچھنا تھا کہ یہاں قریب میں کوئی ویڈیو سینٹر کی دُکان ہے۔" چھوٹی دادی نے کہا۔ میں نے بتایا "دادی ہے تو سہی" کہنے لگیں ذاکر سے کہنا کہ چھوٹی دادی نے کہا ہے کہ شام کو ویڈیو والوں کے ہاں سے نئی فلموں کی لسٹ ضرور لے آئے۔ چھوٹی دادی کی یہ فرمائش سن کر ہمیں جو تھوڑی بہت نیند آ رہی تھی۔ وہ بھی اڑ گئی۔

چھوٹی دادی جان نے نیا حکم صادر فرمایا "ذرا آج کا اخبار دو۔"

"اچھا اخبار، اخبار تو میں بھی کل سے تلاش کر رہی ہوں مگر مل نہیں رہا۔"

"آج کا اخبار کل سے تلاش کر رہی ہے دماغ تو نہیں چل گیا۔" ہم نے صاف گوئی سے بتایا "جی چھوٹی دادی جان کل کا اخبار ہی تلاش کر رہی ہوں کیونکہ اردو اخبار اب ہمارے گھر صرف بدھ اور جمعہ ہی کو آتا ہے لہٰذا بدھ کا اخبار کل سے تلاش کر رہی ہوں تازہ اخبار کل صبح ملاحظہ فرمایئے گا۔"

"اچھا تو کیا کر رہی ہے چل کاپی کتاب لا مجھ سے پڑھ، بہت شریر معلوم ہوتی ہے۔" چھوٹی دادی جان کے اس مطالبے پر تو ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ کوئی ڈھائی گھنٹے قبل ہم نے اپنے آپ کو جس کلاس کی طالبہ ظاہر کیا تھا یوں سمجھئے کہ بنی بنائی عزت خاک میں مل رہی تھی۔ ہم نے فوراً دادی جان کے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"دادی جان یہاں چڑیا گھر بہت قریب ہے اور نئے جانور بھی آئے ہیں کیوں نہ آج کی شام ہم چڑیا گھر میں گزاریں آپ کی تفریح بھی ہو جائے گی۔"

چھوٹی دادی نے خوش ہو کر کہا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اچھے کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ بس جلدی سے تیاری کرو چلنے کی۔

یہ سننا تھا اور ہم پانچ چھوٹے بہن بھائیوں سمیت تیار ہو کر چھوٹی دادی کے حضور پیش ہو گئے۔ ہماری چھوٹی بہن حسنہ نے دادی جان سے سوال کیا، دادی جان انڈیا میں بھی چڑیا گھر ہوں گے؟ کیوں نہیں بیٹی بلکہ ہمارا گھر تو گارڈن پر ہی ہے۔

ذاکر نے فوراً پوچھا "تو کیا انڈیا میں گھر گارڈن (چڑیا گھر) میں ہوتے ہیں"؟

نہیں بیٹا میرا مطلب ہے ہمارا گھر وہاں گارڈن کے قریب ہے۔

خیر جناب چھ افراد کا ایک وفد جس کی قیادت چھوٹی دادی جان نے کی چڑیا گھر کی سیر کو گیا شام کو گھر لوٹے تو دیکھا کچھ نئے مہمان گھر میں آئے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا چھوٹی دادی کی بیٹی داماد وغیرہ ہیں ہماری خبر رساں ایجنسی نے خبر دی کہ یہ مہمان چھوٹی دادی کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔

جاتے وقت ہم بھی مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے آئے، چھوٹی دادی جان نے معصومیت سے ہم سے کہا "بیٹی صائمہ! بس کیا بتاؤں صرف پندرہ دن کا ویزا ملا ہے اور پاکستان میں رشتے دار بہت ہیں۔ وقت اور موقع ملا تو تمہارے گھر آؤں گی ۔ خدا حافظ۔

سچی بات ہی ہے کہ چھوٹی دادی جان کیا گئیں۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دنوں بعد ایسی بزرگ شخصیتیں بھی کہاں باقی رہیں گی۔

قدیم ترین

ایک ڈاکٹر، ایک ماہر تعمیرات، ایک وکیل اور ایک سیاست دان کھانے کے دوران اس بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ دنیا کا سب سے قدیم ترین پیشہ کون سا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا، "طب کا پیشہ قدیم ترین ہے، کیونکہ جب حضرت بی بی حوا کو حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا تو یہ کام ظاہر ہے کہ جراحی کے ذریعے سے ہی ہوا ہو گا۔"

ماہر تعمیرات نے کہا، "آپ کا خیال درست ہے، مگر جب دنیا میں حضرت آدمؑ کی ملاقات حضرت بی بی حوا سے ہوئی تو انھیں فوری ضرورت ایک مکان کی تھی اب ظاہر ہے مکان کی تعمیر فن تعمیر کے بغیر نہیں ہوئی ہو گی۔"

وکیل نے کہا، "تعمیر سے پہلے دنیا شدید بحران میں تھی جسے صرف ایک وکیل ہی دور کر سکتا تھا۔"

اس پر سیاست دان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "بھئی ذرا یہ بھی تو سوچو کہ وہ بحران آخر کس نے پیدا کیا تھا۔"

ندیم احمد، محمد اسمٰعیل، حیدر آباد

نئے لکھنے والوں کی مختصر تحریروں کا مستقل سلسلہ

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہو سکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام، پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔
(ادارہ)

نعت رسولِ اکرمؐ

محمد نوید مرزا۔ لاہور

زمانے کے پیارے، خدا کے دُلارے
نقوشِ قدم جن کے ہیں چاند تارے

بنیں کام بگڑے ہوئے اس کے سارے
جو صدق و صفا سے پکارے محمدؐ

میری زندگی ہے اُنھیں سے عبارت
غمِ مصطفےٰ میں جو لمحے گزارے

"بابائے قوم کے نام پاکستانی بچوں کا خط"

تحریر:۔ نصرت جہاں

پیارے بابا جان السلام علیکم

ہم باب الاسلام کے خوبصورت مگر خون وبارود میں اٹے شہر حیدر آباد سے مخاطب ہیں۔ پیارے بابا جان آج آپ کی سالگرہ کا دن ہے۔ اور ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی ہم سب جوش و خروش کے ساتھ یہ دن منا رہے ہیں۔ آپ کے اقوال سے اپنی تقدیر کو خوبصورت بنا رہے ہیں۔ پوری قوم آپ سے عقیدت و محبت کا اظہار (زبانی) کر رہی ہے۔ پیارے قائد ہم پاکستانی بچے سوچ رہے ہیں کہ اس موقع پر آپ کو کیا پیش کریں۔ ہمارے پاس آنسوؤں۔ آہوں اور شرمندگیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پیارے بابا جان یہ ملک جو آپ نے اور لاکھوں بزرگوں نے عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے بعد اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے حاصل کیا تھا۔ آج۔ ظلم۔ سفارش۔ رشوت۔ وی ۔ سی۔ آر۔ اسمگلنگ۔ اغوا بیروز گاری۔ قتل وغارتگری میں گھرا ہوا ہے۔ آج ملک کے معماروں کے ہاتھوں میں قلم اور کتاب کے بجائے کلاشن کوف ہے۔ درسگاہیں میدان جنگ بن گئی ہیں۔ ملک کے مستقبل کو منشیات جیسی لعنت نے تباہ کر دیا ہے۔ پیارے قائد ہم شرمندہ ہیں کہ وہ قوم جس کا اللہ ایک۔ رسولؐ ایک مذہب ایک۔ مقصد ایک ہے۔ آپس میں دست و گریباں ہے۔ آج باب الاسلام نفرت کی آگ میں جل رہا ہے۔ اپنے ہی اس چمن کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا لہو بہا رہے ہیں۔ پیارے قائد جس چراغ کو جلانے کے لئے لاکھوں چراغ بجھ گئے۔ آج اپنے ہی اس چراغ کو بجھا رہے ہیں۔ پیارے بابا جان یہ وطن غیروں کے نہیں اپنوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے۔ پیارے قائد آپ کے بعد ہمیں کوئی مخلص رہنما نہیں مل سکا۔ ہمارے سیاستداں اقتدار کے لئے آپس میں لڑتے رہے۔ سیاستدانوں کے اقتدار کی ہوس کی وجہ سے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ بقول شاعر۔

راہزن سے اب کوئی شکوہ کرے تو کیا کرے
راہبر کے ہاتھ اب تو قافلہ لٹنے لگا

پیارے قائد آج ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ لیکن ہم سے مایوس نہ ہوں۔ اس ملک کے دشمن بہت ہیں۔ لیکن اس پر جان قربان کرنے والے بھی بہت ہیں۔ پیارے بابا جان ہم عہد کرتے ہیں کہ اس ملک کی حفاظت کریں گے۔ اس ملک کو امن و محبت کا گہوارہ بنائیں گے۔ اس پاک وطن کو رشوت۔ وی سی آر

کلاشن کوف جیسی لعنتوں سے پاک کر کے دم لیں گے۔ لیکن پیارے قائد آج ہمیں اس موڑ پر آپ جیسے قائد کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے مخلص اور عظیم رہنما کی ضرورت ہے۔

اللہ حافظ

فقط والسلام

پاکستانی بچے

معلومات

مرسلہ...... امجد حسین کراچی

۱۔ اسلام میں "سیف اللہ" کا خطاب کس صحابیؓ کو ملا؟

۲۔ اسلام کے پہلے موذن کون تھے؟

۳۔ حضرت اسماعیلؑ کا لقب کیا ہے؟

۴۔ ایک بالغ جسم میں کل کتنی ہڈیاں ہوتی ہے؟

۵۔ انسانی خون کے کتنے گروپ ہوتے ہیں؟

۶۔ انسان کے دل کے کتنے خانے ہوتے ہیں؟

۷۔ ٹیسٹ کرکٹ میں تیز ترین سنچری بنانے والے کھلاڑی کا نام بتایئے؟

۸۔ پاکستان کی طرف سے سب سے زیادہ وکٹ لینے والے بولر کا نام بتایئے؟

جوابات

(۱) حضرت خلد بن ولیدؓ
(۲) حضرت بلال حبشیؓ
(۳) ذبیح اللہ
(۴) ۲۰۶
(۵) چار
(۶) چار
(۷) ویوین رچرڈ
(۸) عمران خان

اقوال زریں

مظہر الاسلام صدیقی

○ شک کرنا گناہ ہے۔

○ غلامی سے موت بہتر ہے

○ اپنی غلطی پر نادم ہونا دانائی ہے۔

○ مصیبت پر صبر کرنا عبادت ہے۔

○ خوف خدا دانائی کی بنیاد ہے۔

○ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

○ علم ایک ایسی روشنی ہے۔ جو جہالت میں چمکتی ہے۔

○ دل کی سب سے بڑی بیماری "حسد" ہے۔

آنسو

ضرغام راجہ

"کس کا فون تھا۔" احمد نے سلیم سے پوچھا۔

"ذیشان کا۔" سلیم نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں کیا تھا اس نے فون؟" احمد نے پھر پوچھا۔

"نوکری چھوٹ گئی ہے اس کا غم منا رہا ہے۔" سلیم بولا۔

"کیا مطلب؟"

"بس یار کمپنی کو نقصان ہوا تو انہوں نے چھانٹی کر دی اس چھانٹی میں ذیشان کا نام بھی آگیا۔ یہی دکھڑا رو رہا تھا۔" سلیم بولا۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا ذیشان تو بہت پریشان

ہوگا۔" احمد بولا

"پریشانی تو لازمی ہے مگر یار مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو ذرا ذرا سی بات پر رونے بیٹھ جاتے ہیں اور عقل سے ذرا سا کام نہیں لیتے اور جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔" سلیم نے کہا۔

"کبھی کبھی جذبات عقل سے بھی زیادہ اہم ہوجاتے ہیں، اور جو کام عقل سے نہیں ہوتے وہ جذبات کے ذریعہ ہوجاتے ہیں۔" احمد بولا۔

"میں نہیں مانتا کہ جذبات سے بھی کوئی کام نکل سکتا ہے۔" سلیم نے اٹل لہجے میں احمد سے کہا۔

سلیم ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کی عمر پچیس تیس سل تھی مگر اس عمر میں ہی اس نے ترقی کی اتنی منازل طے کرلی تھیں کہ اکثر لوگ ساری ساری عمر میں وہاں تک نہیں پہنچ پاتے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی سلیم اپنی شاندار کار میں بیٹھ کر ہواخوری کے لئے نکل پڑا۔

چوڑے روڈ پر آتے ہی سلیم کے پاؤں حسب عادت ایکسیلیٹر پر دبتے چلے گئے۔ ایک سو ساٹھ میل، ایک سو ستر میل۔ اچانک اسے سامنے سے ایک ٹرک آتا نظر آیا۔ ٹرک سیدھا اس کی کار کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ سلیم نے کار کو بچانے کی پوری کوشش کی مگر سڑک کے دونوں جانب کھائیاں تھیں۔ آخر ٹرک نے سلیم کی کار کو سائیڈ سے ٹکر ماردی۔ کار لٹو کی طرح گھومتی ہوئی کھائی میں جاگری۔ سلیم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے منوں بوجھ اس کے سینے پر آگرا ہو اور وہ بیہوش ہوگیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر وہ ہل نہ سکا درد کی ایک شدید لہر اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی وہ اپنے آپ کو قطعی بے بس اور مجبور محسوس کرنے لگا۔

اس نے اپنی پتلیاں گھما کر دیکھا وہ اپنی کار میں آڑا ترچھا پڑا تھا اس کی آنکھوں پر مٹی اور کیچڑ کی تہہ جمی ہوئی تھی اس کا سر دروازے سے ٹکرانے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا جس میں خون بہہ بہہ کر خود ہی بند ہوگیا تھا۔

اچانک اسے اپنے قریب کچھ آوازیں محسوس ہوئیں۔ ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

اچانک کسی نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ سلیم نے دیکھا وہ ایک لمبوترے چہرے والا آدمی تھا، اس کے پیچھے ایک آدمی اور کھڑا تھا۔ پھر سلیم کو آواز سنائی دی "اس آدمی کو دیکھ شیدے اسٹیئرنگ وہیل پورے کا پورا بیچارے کے سینے میں گھس گیا۔"

"چل جلدی سے کام کرلے ورنہ امدادی پارٹی آجائے گی۔" ایک آواز ابھری۔ پھر ان دونوں نے مل کر سلیم کی جیب سے بٹوہ نکالا اس کی کلائی پر سے گھڑی اور انگلی سے سونے کی انگوٹھی بھی اتارلی اور کار میں سے دیگر قیمتی سامان چرا کر چلتے بنے۔ سلیم نے بہت چاہا کہ ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے مگر وہ ناکام رہا۔

سلیم کو اس حالت میں لیٹے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ رات سر پر آن پہنچی سلیم کو اندازہ تھا کہ اگر اور کچھ دیر تک امدادی پارٹی نہ آئی تو وہ بے موت مارا جائے گا۔

اچانک وہ چونک پڑا اسے اپنے قریب کچھ لوگوں کی آوازیں آئیں۔ اس کے چند لمحوں بعد کسی نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔

"امدادی پارٹی آئی۔" سلیم نے سوچا۔

"یہ تو مرچکا ہے۔" سلیم کو ایک آواز سنائی دی۔

"صحیح کہتے ہو تم اس کا سر بری طرح کچلا گیا ہے اور اسٹیئرنگ وہیل بھی سینے میں بری طرح گھس گیا ہے اس حالت میں کون زندہ بچتا ہے۔" دوسری افسوس زدہ آواز ابھری۔

"ام...... مجھے حرکت کرنی چاہئے۔" سلیم نے سوچا مگر باوجود کوشش کے وہ کسی قسم کی حرکت نہ کرسکا انتہائی غم اور صدمے سے بیہوش ہوگیا۔

جب سلیم کو ہوش آیا تو وہ کسی ٹرک میں سفر کررہا تھا۔ ٹرک میں اس کے ساتھ کچھ انسانی جسم اور بھی تھے۔

"یہ یقیناً لاش ہوگی ...... اوہ میرے خدا کیا سب نے مجھے مردہ تسلیم کرلیا ہے ...... اف میں کیا کروں؟" سلیم نے سوچا اس کا دل ڈوب گیا۔

آخر کار ٹرک رک گیا۔ تمام جسموں کے ساتھ اسے بھی اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا گیا۔

"یہ اچھا موقعہ ہے" سلیم نے سوچا مجھے حرکت کرنی چاہئے۔

سلیم نے انتہائی کوشش کی مگر اس کے جسم کے ہر عضو نے اس کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔

اسٹریچر ایک کمرے میں آکر رک گیا۔ ایک ڈاکٹر سلیم پر جھک گیا۔ "یہ اچھا موقعہ ہے۔" سلیم نے سوچا اور حرکت کرنے کی کوشش کی اس نے آواز نکالنے کی کوشش بھی کی مگر آواز اس کے حلق تک آکر رک گئی۔

"اُف کیسی شکل ہوگئی بیچارے کی۔"...... ڈاکٹر کے منہ سے نکلا پھر سلیم کو گہری نظر سے دیکھتا ہوا بولا۔

"بیچارے کا سینہ اور سر بری طرح کچلا گیا ہے ایسے حادثے میں کون زندہ بچتا ہے۔ اسے سرد خانے میں لے جاؤ۔"

"نہیں یہ آخری موقعہ ہے۔" سلیم نے سوچا، "اس کے بعد سب ختم ہوجائے گا۔" ڈاکٹر سلیم کو غور سے دیکھ رہا تھا سلیم نے اپنے جسم پر انتہائی دباؤ ڈالا کوئی حرکت، کوئی جنبش ہوسکے مگر...... مگر وہ ناکام رہا......

آخر سلیم نے حوصلہ ہار دیا" اب اس کی نجات ممکن نہیں...... وہ زندہ ہی قبر میں اتار دیا جائے گا۔ سلیم نے سوچا۔

سلیم خود کو آنے والے وقت کے لئے تیار کرنے لگا۔ اسے ایک ایک کرکے اپنے رشتہ دار عزیز و دوست یاد آنے لگے۔ اس کا دل بھر آیا اس کے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی اور وہ رونے لگا آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"ڈاکٹر...... ڈاکٹر اس آدمی کی آنکھوں پر جمی

مٹی سے پانی نکل رہا ہے۔" سلیم کو ایک آواز سنائی دی۔

"پانی نکل رہا ہے۔" ڈاکٹر حیرت سے بولا اور بھاگ کر سلیم کے قریب آیا۔ "جلدی سے روئی لاؤ" ڈاکٹر چیخا روئی آتے ہی ڈاکٹر نے سلیم کی آنکھوں پر جمی مٹی صاف کر دی۔

"اوہ میرے خدا یہ تو زندہ ہے اور یہ پانی یقیناً اس کے آنسو ہیں۔" ڈاکٹر چیخ اٹھا سلیم نے بے یقینی سے ڈاکٹر کو دیکھا ڈاکٹر نے اس کے دل کے مقام پر اسٹیتھسکوپ رکھا اور فوراً سیدھا ہوتے ہوئے چیخا۔ "اس کے دل کی دھڑکن ابھی جاری ہے، جلدی سے اسے آپریشن روم میں لے چلو۔" دوسرے ہی لمحے سلیم کا اسٹریچر آپریشن روم کی طرف جا رہا تھا اور سلیم کے کانوں میں احمد کے الفاظ گونج رہے تھے......

"جہاں عقل ساتھ چھوڑ دے وہاں اکثر کام جذبات سے نکل جاتے ہیں۔"

البرٹ آئن اسٹائن

مرسلہ۔ رانا گلزار...... مظفر گڑھ

آئن اسٹائن ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جرمنی کے شہر "الم" میں پیدا ہوا اس کو جدید طبیعیات اور نظریہ اضافیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ آئن اسٹائن یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنا بچپن "میونخ" میں گزارا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا آئن اسٹائن کے خیالات و افکار میں پختگی آتی گئی۔ اس نے زیورچ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ جب آئن اسٹائن کے باپ نے اٹلی میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو آئن اسٹائن نے

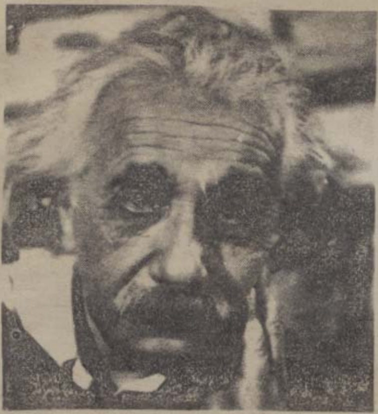

جانے سے انکار کر دیا۔ اور سوئزر لینڈ میں رہائش پذیر ہو گیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے روشنی کی رفتار جاننے کے لئے اپنے تجربات کا آغاز کیا۔ آخر کار ۱۹۰۵ء میں اسے کامیابی حاصل ہوئی اس نے اپنے مشہور نظریئے اضافت پر ایک مقالہ میں لکھا کہ روشنی تمام اطراف میں مساوی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ جب یہ نظریات منظر عام پر آئے تو لوگوں نے اسے کے اس کارنامے کو سرہا۔ ۱۹۱۱ء میں پراگ کی جرمن یونیورسٹی نے اسے پروفیسر بننے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا۔ لیکن یہاں اس کا دل نہ لگا بالآخر برلن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمن نے یہودیوں پر مظالم ڈھانا شروع کر دیئے تو آئن اسٹائن بھی ان سے نہ بچ سکا۔ جرمنوں نے اس پر الزام لگایا کہ جنگ کے دوران اس نے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ جرمنوں کے اس رویہ سے تنگ آکر آئن اسٹائن امریکہ چلا گیا۔ جہاں اسے نیو جرسی نامی امریکہ کے علمی نوعیت کے ادارے میں اعلیٰ عہدے پر رکھ لیا گیا۔ یہاں پر اسے تجربات اور غور و فکر کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ آئن

اپنی نگارشات
صاف خوشخط کاغذ کے ایک
جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں

نقل شدہ، طویل اور
غیر معیاری تحریریں شائع
نہ ہوسکیں گی

جو تحریر آپ ہمیں بھجوائیں
اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
اور ہم سے واپسی کا تقاضہ نہ کریں

اسٹائن نظریاتی یا فکری طبیعیات کا بانی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ذہن کو لیبارٹری میں تجربے کرنے کے بجائے مختلف مسائل حل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس کا سب سے پہلا کارنامہ براؤنی حرکت (brownium movement) کے نام سے مشہور ہوا۔ جس میں اس نے حرکت کے متعلق ایک مختلف اور انقلاب انگیز نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے نظریات اضافیت کو مکمل کر لیا۔ اس نظریئے میں کشش ثقل سے متعلق مساواتیں بھی ظاہر کی گئی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں فوٹو الیکٹرک پر قابل قدر کام کرنے پر نوبل انعام دیا گیا۔ دنیا کا یہ عظیم سائنس دان ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

لنگڑا بادشاہ

احسان الحق حقانی۔ منگورہ

ایک تھا شہزادہ۔ اتفاق سے وہ ایک پاؤں سے لنگڑا تھا۔ اس کے دوست اور بزرگ اسے لنگڑا کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ لیکن جونہی وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد بادشاہ بن گیا۔ تو اس نے سب سے پہلے یہ حکم جاری کیا۔ کہ "جس نے مجھے لنگڑا کہا۔ یا میرے سامنے لنگڑاہٹ کا ذکر کیا۔ اسکا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

جس طرح اچھے اور شریف لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اسطرح برے اور شریر لوگ بھی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان برے اور شدیر لوگوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ کہ اچھے لوگوں کے صبر اور اخلاق کا امتحان لیا جاسکے۔

اچھا تو بات لنگڑے شہزادے کی ہو رہی تھی۔ جو کہ اب لنگڑا بادشاہ بن چکا تھا۔ اس کے دربار میں ایک شریر وزیر تھا۔ اس نے ایک درباری سے شرط لگادی۔ کہ اگر تو نے بادشاہ کے سامنے لنگڑاہٹ کا ذکر کیا۔ تو میں تمہیں ایک سونے کی اشرفی دے دوں گا۔

درباری نے کہا کہ "اگر میں نے بادشاہ کے سامنے دس مرتبہ لنگڑا، لنگڑا، کہہ دیا۔ تو کیا تم مجھے دس اشرفیاں دو گے؟"

"ٹھیک ہے" درباری نے کہا۔ "میں تین دن بعد دربار میں آؤنگا۔ تم منشی کو بٹھا دینا تاکہ وہ حساب کتاب لگا سکے۔ کہ میں کتنی مرتبہ بادشاہ کے سامنے لنگڑا، لنگڑا کہتا ہوں۔"

تین دن بعد جب درباری، دربار میں حاضر ہوا۔ تو بادشاہ نے اس سے پوچھا "ارے او درباری! تم اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟"

"کچھ نہ پوچھئے حضور! میرا دل نہیں چاہتا۔ کہ ماجرا سناؤں" درباری نے دست بستہ ہو کر عرض کیا۔

"بکواس بند کرنے کا بندوبست کر دیا جائے" بادشاہ نے جلال میں آکر کہا "ہم جو کچھ پوچھ رہے ہیں۔ صرف اسکا جواب دیا جائے۔"

"بادشاہ سلامت! میرا دل تو نہیں چاہتا۔ لیکن آپ اصرار کرتے ہیں۔ تو جان کی امان پا کر ہی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔" درباری نے کہا۔

"ہم تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہیں۔ اب بکو جو بکنا ہے۔" لنگڑے بادشاہ نے کہا۔

"بادشاہ سلامت! بات یہ ہے۔ کہ میں تین دن پہلے اپنے ملک کے پڑوس والے ریاست میں گیا تھا۔" درباری نے بات کا آغاز کرتے ہوئے۔ "وہاں ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا۔ کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ تو میں نے اسے اپنے ملک کا نام بتا دیا۔ اس نالائق آدمی نے جب یہ سنا۔ تو کہنے لگا۔ کہ اچھا تم اس لنگڑے بادشاہ کے ملک سے آئے ہو۔"

درباری نے وزیر کی طرف آنکھ مارتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "بادشاہ سلامت!" جب اس نے آپ کو لنگڑا کہا۔ تو مجھے بہت غصہ آگیا۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔ کہ خبردار جو ہمارے بادشاہ کو لنگڑا کہا۔ لنگڑے ہو گے تم۔ لنگڑا ہو گا تمہارا باپ! اگر تم میں غیرت ہو۔ تو ہمارے ملک میں آکر ہمارے بادشاہ کو لنگڑا کہہ دو۔ ہم تمہاری گردن اڑا دیں گے۔"

"عالی جاہ! اس بے حیا آدمی نے بجائے خوفزدہ ہونے کے، یہ کہا۔ کہ جب تمہارا بادشاہ لنگڑا ہے۔ تو اسے لنگڑا کہنا کوئی غلط بات تو نہیں۔ میں تو اسے لنگڑا کہوں گا۔ لنگڑا۔ لنگڑا، لنگڑا ہے۔ تمہارا بادشاہ لنگڑا ہے۔"

"بس بادشاہ سلامت! مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ میں اس آدمی پر جھپٹ پڑا۔ کہ خبردار! اب اگر ہمارے بادشاہ کو لنگڑا کہا۔ تو میں تمہیں لنگڑا کر دوں گا۔ لیکن وہ آدمی دوڑ کر چلانے لگا۔ "کہ لنگڑا، لنگڑا، لنگڑا ہے۔ تمہارا بادشاہ لنگڑا ہے۔ لنگڑا ہے۔......"

"بس بس بس...... خدا کے بندے! بس کرو۔ تم نے تو ہمیں لوٹ لیا۔" وزیر نے درمیان میں لپک کر اس آدمی کو خاموش کر دیا۔

بادشاہ نے درباری کی وفاداری سے خوش ہو کر اسے بہت سا انعام دیا۔ اور وزیر نے بھی شرط کے مطابق اسے ۱۹ سونے کی اشرفیاں دیں۔

مچھلی

(عمران نوشیر، جڑانوالہ)

دنیا کا سب سے بڑا جانور نیلی وھیل ہے۔ اس کا

شمار دودھ پلانے والے جانوروں میں ہوتا ہے۔ اس کی عمر ۵۰۰ سال تک ہوتی ہے۔ اس کے ۲۴۰۷ دانت ہوتے ہیں اور بعض وہیل مچھلیوں کے دانت تو دو گز تک لمبے ہوتے ہیں۔ مچھلیوں کی ایک قسم شارک کہلاتی ہے شارک کی ۲۲۵ اقسام ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ خطرناک "واہاہٹ شارک" ہے۔ یہ عموماً ۲۰۔ ۲۲ فٹ کے لگ بھگ لمبی ہوتی ہے۔ شارک کی دو اقسام "ھیمرہیڈ شارک" اور "ڈاگ فش" کراچی کے ساحل کے قریب سمندر میں عام ملتی ہے۔

"الیکٹرک رے فش" بھی شارک کے قبیلہ سے ہے اس کے جسم میں الیکٹرک ہیل سیل ہوتے ہیں جن سے الیکٹرک شارک چھوڑ کو شکار کو ہلاک کر دیتی ہے۔ "سی ہارس" سمندر کی سب سے عجیب مچھلی ہے یہ دور سے دیکھنے سے گھوڑے کی مانند نظر آتی ہے۔ "گلڈی فش جس کی رفتار ۳۰ میل فی گھنٹہ ہے نصف میل تک اڑ سکتی ہے۔ "لہروں کی شہزادی" ڈولفن مچھلی کو کہا جاتا ہے۔ یہ حیرت انگیز صلاحیتوں کی ملک ہوتی ہے۔

حیرت انگیز

مرسلہ:۔ ثناء اللہ۔

عام لوگوں کی تو پانچ انگلیاں ہوتی ہیں لیکن اسپین کے ایک گاؤں میں رہنے والے عام باشندوں کے ہاتھ اور پاؤں میں سات سات انگلیاں ہوتی ہیں اور ان میں چھ چھ پور ہوتے ہیں۔ یہ بات وہاں رہنے والوں کے لئے اتنی عام ہے کہ وہ ۵ انگلیوں والے شخص کو عجیب آدمی سمجھتے ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات۔

گرمی

فضل احمد فانی ...... ضلع جھنگ

موسم نے پھر پلٹا کھایا
گرمی کا ہے موسم آیا
کل تھی سردی آج ہے گرمی
خوب ہیں تیرے رنگ خدایا
جو بھی گھر سے باہر آیا
باہر آتے ہی پچھتایا
لو ہے گویا آگ کے شعلے
اس نے ہر شے کو پگھلایا
اڑ گئی بھینی بھینی خوشبو
گلشن میں ہر گل مرجھایا
چائے سے اب رغبت کس کو
ٹھنڈا ٹھنڈا شربت بھایا

پچھتاوا

رخسانہ کریم شیخ ...... سکھر

ہم ذرا شرارتی قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ پڑھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ خدا بھلا کرے ہماری مس حنا کا جو ہمیں ہر سال پاس کروا دیتی تھیں۔ مس حنا ہماری کلاس ٹیچر تھیں، ہماری رپورٹ کارڈز بھی وہی لاتی تھیں ہماری رپورٹ پر وہ مارکس بڑھا کر لاتی تھیں تاکہ ہم پاس ہو جائیں۔ ہماری مس سے بڑی دوستی تھی، اور ہم ہر وقت ان کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ دراصل انہیں کام ہمارے ابو سے پڑتے رہتے تھے ہم ابو سے کہہ کر ان کا کام کروا دیتے تھے۔ اس طرح ہم ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتے تھے۔ گھر میں کبھی وی سی آر دیکھتے تو کبھی وڈیو گیم کھیلتے۔ اس طرح وقت گزرتا تھا۔

ہماری شرارتوں کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ہماری کلاس فیلو "علیزا" کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے ہمیں دعوت دی، کہ پرسوں شام کو دوسرے دن ہم نے اسے بتایا "میں نے تمھارے لئے خوبصورت جوڑا خریدا ہے جو کہ میں تمہیں سالگرہ پر گفٹ دونگی" یہ سن کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اور اسی وقت ہمارے لئے ہوٹل سے چکن روسٹ منگوائے ہم نے خوب چکن کھائے۔

لیکن جناب ہم کہاں ہیں گفٹ دینے والے۔ ہم ٹھہرے کنجوس آدمی۔ دوسرے دن ہم ڈبے میں تین پتھر اور مرا ہوا مینڈک ڈال کر خوب سجا کر لے گئے۔ "علیزا" گفٹ دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔ کیک کاٹا گیا ہم نے خوب کھایا پھر جب گفٹ کھولنے کا مرحلہ آیا، تو ہم وہاں سے بھاگ آئے۔

دوسرے دن ہمارا جو حشر ہوا مت پوچھئے یہ شرارتیں ہمارا روز مرہ کا معمول بن گئیں تھیں۔ پھر اچانک ایک روز خبر سنی جسے سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے۔ مس حنا کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ ہم بڑے پریشان ہوئے، مگر اب کیا ہو گا۔ خیر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور کامیاب بیورو کریٹ کی طرح آنے والی حکومت (مس عا۔۔۔۔ہ) سے راہ ورسم بڑھائی، لیکن یہ اصول پسند حکومت ہمیں راس نہ آئی اور الٹا ہمیں جھڑک دیا۔ تب ہم نے سوچا "بھلا اس دور میں مس حنا جیسی ایماندار استانیاں کہاں ملتی ہیں۔"

مجبوراً ہم نے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن پھر بھی ہم فیل ہو گئے۔ جب امی ابو کو پتہ چلا کہ ہم فیل ہو گئے ہیں تو انھوں نے خوب ڈانٹا۔ ہم بہت پچھتا رہے تھے کہ کاش ہم پڑھتے تو فیل نہ ہوتے۔ آجکل ہم ایک بار پھر چھٹی جماعت میں پڑھ رہے ہیں اب ہم بہت محنت کرتے ہیں اور شرارتیں کرنا بند کر دی ہیں ہمیں امید ہے کہ اس بار ہم پاس ہو جائیں گے۔

ستمبر کے شمارے میں شائع شدہ کاشف عرفان کی نظم مسٹر عالمگیر نقل شدہ تھی۔ اکتوبر میں منعقدہ مقابلہ مصوری میں دانیہ جبار اور شہزاد علی شاہ کی ارسال کردہ تصاویر بھی نقل شدہ تھیں ان تینوں حضرات کو بلیک باکس کیا جاتا ہے۔ ادارہ عمر اختر صاحب، وسیم عباس صاحب اور بشیر احمد مغل صاحب کا ممنون ہے جنھوں نے ثبوت فراہم کیے ہیں۔

(ادارہ)

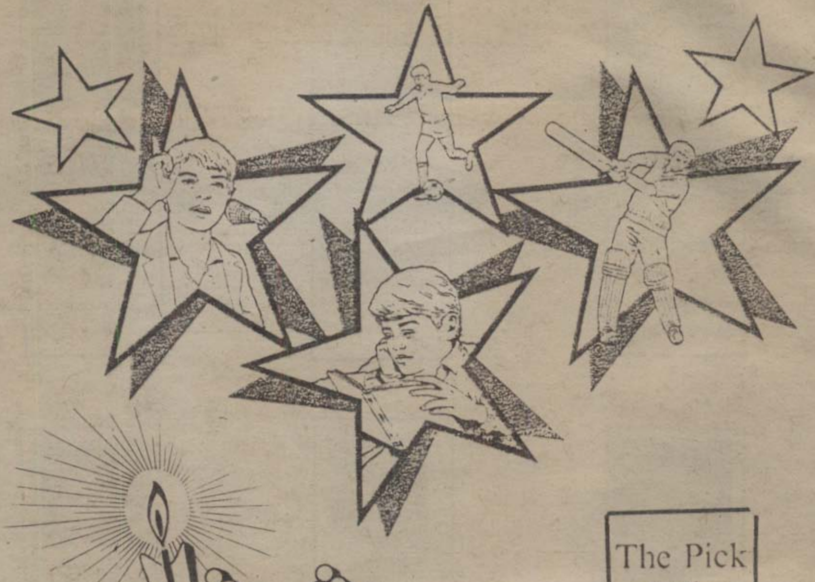

روشن مثال

The Pick of The month

ان ساتھیوں کا تعارف

جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

محمد زُہیر

میٹرک میں اے ون گریڈ

۱۶ سال، فرسٹ ایئر، مطالعہ
فٹ بال، فزکس۔
مکان نمبر ۴ جامعہ اشرفیہ مسلم
ٹاؤن لاہور۔

شہزاد رمضان علی

میٹرک میں اے گریڈ

۱۶ سال، X اردو، بہترین کتب
کا مطالعہ۔
۷۰/کے رحیم آباد کالونی فیڈرل
بی ایریا بلاک ۱۶ کراچی۔

ریحان ظفر

میٹرک میں اے گریڈ

۱۷ سال، گیارہویں، کرکٹ کھیلنا
مطالعہ کرنا، ڈرائنگ، بیالوجی۔
۵۶۲/A بلاک نمبر ۵ گلشن اقبال
کراچی۔

محمد مدثر فاروقی

اسکاؤٹنگ میں سرٹیفکیٹس

۱۴ سال، نہم سائنس، باغبانی
مطالعہ۔
۲۰ بی مہران دیو پلازہ بندر روڈ
سکھر۔

مصدق عنایت

اوّل تا ہفتم ہر جماعت میں اوّل پوزیشن

۱۲ سال، ہشتم الف، کرکٹ،
ٹکٹ جمع کرنا۔ سائنس
محلہ شاد باغ، لالہ موسیٰ۔

شاہد حسین

میٹرک میں اے۔ گریڈ

۱۷ سال، فرسٹ ایئر، اردو، کرکٹ کھیلنا۔
شاہد حسین ولد حاجی محمد اسحٰق مرحوم
جان محمد اسٹریٹ رضوان پارک
نزد موہڑہ شریف لاہور۔

ملک ظہیر انور

جماعت چہارم، پنجم میں اوّل پوزیشن۔

۱۰ سال، ششم، اردو رسائل
کا مطالعہ کرنا۔
۳۲، ظفر علی روڈ نزد واٹر
ورکس پرانا شہر شیخوپورہ۔

نوید فاروق

پہلی تا پنجم اوّل پوزیشن

۱۰ سال، ششم بی، حساب۔
ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔
شہزاد بلڈنگ نصیرہ، تحصیل
کھاریاں ضلع گجرات۔

سفیان کاکاخیل

حسن قرأت اور نعت خوانی میں انعام

۱۰ سال، کلاس ششم، انگلش
ٹکٹ اور سکے اور ماچس جمع
کرنا۔ مکان نمبر ۲۸۷ سیکٹر
۹/۱۴ آئی، اسلام آباد۔

آپ کی تصویر اس فریم
کے سائز میں کٹی ہوئی
ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا
بڑی تصویر قابلِ قبول
نہ ہوگی

سید محمد اطہر حسین

تیراکی میں سرٹیفکیٹ

۱۳ سال، کرکٹ کھیلنا، معلومات
جمع کرنا۔ انگلش
۵ ایریا ۳۶، سی۔ کوارٹر ۱۹۸ کورنگی
نمبر ۵ کراچی نمبر ۳۱

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جابجا کوپن پھاڑنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ کلاس ۔۔۔۔۔۔ عمر ۔۔۔۔۔۔
ارسال کردہ کل رقم ۔۔۔۔۔۔ بذریعہ ۔۔۔۔۔۔ دستخط ۔۔۔۔۔۔
پتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ عمر ۔۔۔۔۔۔ کلاس ۔۔۔۔۔۔
پتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
جواب نمبر (۱) ۔۔۔۔ (۲) ۔۔۔۔ (۳) ۔۔۔۔ (۴) ۔۔۔۔ (۵) ۔۔۔۔
(۶) ۔۔۔۔ (۷) ۔۔۔۔ (۸) ۔۔۔۔ (۹) ۔۔۔۔ (۱۰) ۔۔۔۔

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ عمر ۔۔۔۔۔۔ جماعت ۔۔۔۔۔۔
مشاغل ۔۔۔۔۔۔۔۔ پسندیدہ مضمون ۔۔۔۔۔۔
کوئی اہم کامیابی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر موذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھیے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔ قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

کیا آپ نے بھی کوئی روشن مثال قائم کی ہے ؟

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک سکیں گے جنھوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ...... ۔

○ ...... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہوسکے گا۔

○ ...... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہوسکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو(BESTOFMONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہوسکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر۱۳۵ پر موجود ہے۔

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

سندھ کے مشہور مقام ہالا کے قریب منصورہ نامی ایک بستی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہاں کی ایک درس گاہ اپنی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بہت مشہور تھی۔ جو طلباء بھی یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے وہ عملی میدان میں نمایاں اور کامیاب رہے۔ منصورہ کی اس درس گاہ میں طلباء ہر ماہ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ایک مجلّہ ترتیب دیتے جس کا نام "کاروان خیال" تھا۔ کاروان خیال کا ایک صفحہ ہم والدین کے مطالعے کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ گو ان موضوعات پر سنجیدگی سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے مگر اس بار وہی باتیں کمسن طلباء کے شوخ الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

○ ...... بچہ جو طلب کرے اسے فوراً مہیا کیجئے۔ کیونکہ اس طرح کی صورت حال میں بچہ یقین کے ساتھ پروان چڑھے گا کہ یہ دنیا بڑی خوشگوار اور رہنے کے لائق ہے۔

○ ...... بچہ جب گالی بکے تو خوب دانت نکالئے اور منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنسئے۔ اس طرح وہ محسوس کرے گا کہ وہ بہت دلچسپ حرکت کر رہا ہے۔

○ ...... ہرگز ہرگز اسے روحانی تربیت نہ دیجئے، اکیس (۲۱) سال تک انتظار کیجئے۔ اس کے بعد کھلا چھوڑ دیجئے جو چاہے راستہ اختیار کرے۔

○ ...... بچہ جتنا جیب خرچ مانگے، اسے دیجئے اور اسے کمانے کی عادت نہ ڈالئے آخر وہ مشکلات کیوں برداشت کرے جو آپ نے کی ہیں۔

○ ...... اس کی ہر خواہش اور تقاضے کو پورا کیجئے کیونکہ آپ کا انکار اسے نقصان دہ قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کر سکتا ہے۔

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. No. M-266 DECEMBER 1990

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI